بسم الله الرحمن الرحيم

مجتمع آموزش عالی فقه

مدرسه عالی فقه ومعارف

پایان نامه برای دریافت درجه کارشناسی ارشد

رشته فقه و معارف

عنوان:

جاودانی منشور((ترجمه کتاب منشور جاوید ج٤ به زبان اردو))

استاد راهنما:

حجت الاسلام والمسلمین آقای وزیرعباس دامت توفیقاته

طلبه:

سیدمطهر حسین رضوی

کد کامپیوتری:۱۵۹۹۳۵

انتساب

مظہر صفات یزداں

نفس رسول زماں

کفو سیدۂ نسواں

وارث قرآں

امام انس و جاں

مشکل کشائے جہاں

امیر اہل ایماں

صاحب نہج البیاں

قسیم النار والجناں

حضرت **علی بن عمراں** علیہما السلام کے باشرف نام سے **انتساب** کا شرف، سجدۂ شکر کا مکاں ہے۔

سپاسنامہ

قَالَ رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم : أَشکَرُکُم لِلّٰهِ أَشکَرُکُم لِلنَّاسِ

رسول اسلام ﷺ فرماتے ہیں: تم میں سب سے زیادہ خدا کا شکر گذار بندہ وہ ہے جو لوگوں کا زیادہ شکریہ ادا کرتا ہے۔[1]

شکر ہے اس خدا کا جس نے بندہ کو جہاد بالقلم کی توفیق دی نیز اسی کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس قلمی جہاد کو اتحاد کا ذریعہ قرار دے چونکہ شکر، خدا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے اوراسی نے بندوں کا شکریہ ادا کرنے کا بھی حکم دیا ہے لہذا میں ان سبھی افراد کا شکر گذار ہوں جنہوں نے آغاز کار سے لیکر انجام کار تک تَعاوَنُوا عَلَی البِرِّ وَالتَّقوی [2] پر گامزن رہتے ہوئے نصرت و مدد کی، خصوصی طور پر استاد ارجمند حجۃ الاسلام والمسلمین عالیجناب **وزیر عباس** صاحب دامت افاضتہ کہ جنہوں نے بخوبی رہنمائی کا حق ادا کیا خداوند رحیم! ہم سب کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

۱۔ اصول کافی: ج۲، ص۹۹۔ وسائل الشیعہ: ج۱۶، ص۳۱۰۔ بحار الانوار: ج۶۸، ص۳۸

۲۔ سورۂ مائدہ: آیت ۲

خلاصہ (چکیدہ)

اس کتاب میں پہلے عقل اور قرآن مجید کی روشنی میں مسئلہ عصمت کی تحقیق کی گئی ہے اور عصمت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے پیش کردہ اعتراضات اور شبہات کے جوابات دئے گئے ہیں عصمت انبیاء پر قرآن اور عقلی دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔

عصمت کے درجات اور تمامی مراحل کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے، اسی طرح عصمت کی ضرورت عقل کی روشنی میں واضح کی گئی ہے مقدمہ کے ان مباحث کے بعد ان انبیاء سے متعلق آیات نقل کی گئی ہیں جن کے بارے میں آیات قرآن میں ان کی عصمت کے خلاف الفاظ واشارات پائے جاتے ہیں۔

ان تمام الفاظ کی حسین انداز میں تحقیق کی گئی ہے اور آیات کے اس ابہام کو استدلال کے ساتھ برطرف کیا گیا ہے جو ان انبیاء سے متعلق بعض الفاظ سے پیدا ہوتا تھا۔

مثلاً حضرت آدم کے ترک اولیٰ کی آیات اور شجرہ ممنوعہ کی حقیقت اسی طرح حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف، حضرت سلیمان، حضرت یونس، حضرت ایوب اور خود پیغمبر اسلامؐ سے متعلق آیات کی تحقیق کی گئی ہے۔

اس کے بعد عصمت امام سے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے۔

آخر میں آیت تطہیر کے ذریعہ اہل بیت پیغمبرؐ کی عصمت وطہارت پر استدلالی گفتگو کی گئی ہے۔

مندرجہ ذیل سرخیاں قائم کی ہیں:

۱۔ رجس سے مراد کیا ہے؟

۲۔ ارادہ تکوینی ہے یا تشریعی؟

۳۔ دونوں ارادوں کی خصوصیات کیا ہیں؟

۴۔ تکوینی ارادہ کی صورت میں معصوم آزاد ہے یا مجبور؟

۵۔ تکوینی ارادہ سے وابستہ عصمت قابل افتخار ہے یا کوئی کمال نہیں ہے؟

۶۔ آیت میں طہارت کی خبر مستقبل سے وابستہ ہے؟

۷۔ رجس کا بر طرف ہونا یعنی رجس تھا تو بر طرف ہوا؟

۸۔ اہل بیت کا مفہوم کیا ہے ؟

۹۔ مصداق اہل بیت کون ہے ؟

۱۰۔ بیت سے مراد کیسا گھر ہے اور کتنے گھر ہیں ؟

۱۱۔ ضمیروں کے فرق کی وجہ کیا ہے ؟

۱۲۔ پیغمبر کی زبان سے اہل بیت کی تعیین ؟

۱۳۔ آیت تطہیر کے بارے میں علمائے اسلام کے اقوال

۱۴۔ آیت کے جداگانہ مستقل نزول کا اثبات

۱۵۔ سیاق آیات کے مسئلہ کا حل اور جواب

۱۶۔ آیت کی تفسیر میں متعدد غیر مشہور (شاذ) نظریات کی تفصیل اور تحقیق ورد

اس طرح ایک عمیق استدلالی بحث کے ذریعہ آیت تطہیر سے پیغمبرؐ کے قریب ترین اعزا کی عصمت کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔

فہرست مطالب

مقدمہ مترجم

عصمت کا مسئلہ شیعہ مذہب میں ایک اہم مسئلہ ہے اس مسئلہ مین قرآن مجید اور روایات نے بہت تاکید کی ہے۔

اسلام کے ہر موضوع کی بنیاد عصمت پر ہے اور عصمت کی بنیاد علم پر قائم ہے اب علم بھی خدا داد ہے اور عصمت بھی خدا داد چیز ہے لہٰذا معصوم کے علم و عصمت دونوں خداداد شے ہیں

عصمت کے بارے میں متعدد اعتبارات سے اختلافات پائے جاتے ہیں اسی بنا پر ہم نے اپنے پایان نامہ کا عنوان عصمت کی تحقیق کو قرار دیا، اس موضوع کی تحقیق کے لئے ہم نے متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن جامع ترین کتاب اس پر ہمیں حضرت آیت اللہ العظمٰی جعفر سبحانی کی کتاب تفسیر منشور جاوید کی جلد چہارم لگی اس لئے ہم نے اس موضوع کی تحقیق کے لئے اس کتاب کا انتخاب کیا۔

اس کتاب میں عصمت کے مسئلہ پر مکمل بحث کی گئی ہے نیز مخالفین عصمت کے شبہات و اعتراضات کا مکمل استدلالی جواب دیا گیاہے آیات قرآنی کی مکمل تحقیق پیش کی گئی ہے نیز روایات کی روشنی میں بھی اس عنوان کی وضاحت کی گئی ہے اس کے بعد مخالفین عصمت کے دلائل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

عصمت، عقل اور قرآن کی روشنی میں

لفظ عصمت اپنے تمام الفاظ کے ساتھ پورے قرآن میں تیرہ بار آیا ہے اور اسکے معنی روکنے، تھامنے اور بچانے کے ہیں[۱]

قرآن میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے:

۱)" وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْۚ "[۲]

۲)" وَلَقَدۡ رَٰوَدتُّهُۥ عَن نَّفۡسِهِۦ فَٱسۡتَعۡصَمَ"[۳]

پہلی آیت میں عصمت سے تھامنا اور دوسری آیت میں روکنا مراد ہے، اور دونوں ہی کی بازگشت ایک معنی کی طرف ہے۔

ہماری گفتگو میں عصمت سے مراد اللہ کے مخصوص بندوں کا گناہ اور خطاو نسیان سے محفوظ رہنا ہے۔

عصمت کا تاریخی جائزہ

یہودی چونکہ اپنے پیغمبروں کی طرف نازیبا نسبتیں دیتے ہیں جیسا کہ ان کی تحریف شدہ توریت اس طرح کی نسبتوں سے مملو ہے لہٰذا یہودی پیغمبروں کی عصمت کا عقیدہ نہیں پیش کر سکتے۔

یہی حال عیسائیت کے علماء کا بھی ہے، کہ وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰؑ کو خود خدا یا تثلیث کا یاک جزء جاننے کی وجہ سے پاک وپاکیزہ مانتے ہیں اور بس۔ لہٰذا ان کا یہ عقیدہ بھی سارے نبیوں کی عصمت کا اثبات نہیں کر سکتا۔

اسی بنا پر ایک عیسائی مفکر دونالڈسن اپنی کتاب "عقیدۃ الشیعۃ" اور ایک یہودی مفکر گلدزھیر اپنی کتاب "العقیدۃ والشریعۃ" میں لکھتے ہیں کہ عصمت کا موضوع سب سے پہلے، شیعہ متکلمین نے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ انہوں نے اپنے اماموں کو معصوم ثابت کرنے کے لئے پہلے نبیوں کی عصمت کا مسئلہ پیش کیا۔[۴]

ان مفکرین کا یہ نظریہ صرف ایک وہم وخیال ہے ورنہ عصمت گناہوں سے حفاظت کے معنی میں تو خود قرآن مجید کی متعدد آیات میں منعکس کی گئی ہے، مثلاً فرشتوں کے بارے میں قرآن صراحت سے ان کی عصمت کا عقیدہ پیش کر رہا ہے:

۱۔ مقاییس اللغۃ، ج ا ص ۳۳۱

۲۔ سورہ آل عمران آیت ۱۰۲

۳۔ سورہ یوسف آیت ۳۲

۴۔ عقیدہ الشیعہ، ص ۳۲۸؛ العقیدۃ الشیعہ ص ۱۸۰

"عَلَيۡهَا مَلَـٰٓئِكَةٌ غِلَاظٞ شِدَادٞ لَّا يَعۡصُونَ ٱللَّهَ مَآ أَمَرَهُمۡ وَيَفۡعَلُونَ مَا يُؤۡمَرُونَ "[۱]

مسلمانوں نے صدر اسلام سے اس آیت کی بنیاد پر فرشتوں کو معصوم تسلیم کیا ہے۔

اس طرح خود قرآن کو اللہ نے قرآن میں ہر خطا و غلطی سے محفوظ ہونے کا اعلان فرمایا ہے اور یہ خود قرآن کی عصمت کا اعلان ہے جیسا کہ اعلان ہوا:

"لَّا يَأۡتِيهِ ٱلۡبَـٰطِلُ مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهِۦ "[۲]

"إِنَّ هَـٰذَا ٱلۡقُرۡءَانَ يَهۡدِي لِلَّتِي هِيَ أَقۡوَمُ وَيُبَشِّرُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ٱلَّذِينَ يَعۡمَلُونَ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ أَنَّ لَهُمۡ أَجۡرٗا كَبِيرٗا ۝٩ "[۳]

یہ ساری تعبیرات در حقیقت قرآن کی عصمت کا ثبوت ہیں۔

لہٰذا عصمت کا عقیدہ شیعہ متکلمین سے پہلے خود قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت اور قرآن

جیسا کہ آئندہ ذکر کیا جائے گا کہ عصمت کے درجات اور مراتب ہیں، پیغمبر اسلام کی عصمت اخذ وحی اور ابلاغ وحی میں خود آیات قرآن میں صراحت کے ساتھ ذکر کی گئی ہے:

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ ۝٣ إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٞ يُوحَىٰ ۝٤ "[۴]

۱۔ سورہ تحریم آیت ٦

۲ سورہ فصلت، آیت ۴۲

۳۔ سورہ اسراء آیت ۹

۴۔ سورہ نجم آیت ۳-۴

"مَا كَذَبَ ٱلۡفُؤَادُ مَا رَأَىٰٓ ﴿١١﴾ أَفَتُمَٰرُونَهُۥ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ﴿١٢﴾ وَلَقَدۡ رَءَاهُ نَزۡلَةً أُخۡرَىٰ ﴿١٣﴾ عِندَ سِدۡرَةِ ٱلۡمُنتَهَىٰ ﴿١٤﴾ عِندَهَا جَنَّةُ ٱلۡمَأۡوَىٰٓ ﴿١٥﴾ إِذۡ يَغۡشَى ٱلسِّدۡرَةَ مَا يَغۡشَىٰ ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ ٱلۡبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ﴿١٧﴾ "[1]

اس قسم کی آیات کے ہوتے ہوئے باآسانی یہ کہاجاسکتاہے کہ:

یہودی اور عیسائی مفکر کی گذشتہ تحلیل کہ مسئلہ عصمت شیعوں میں امام صادقؑ کے زمانے میں علم کلام کی ترقی کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، پوری غلط ہے۔

اس لئے کہ یہ مسئلہ خود قرآن کی متعدد آیات میں صراحتاً ذکر کیاگیاہے خواہ ان آیات کا نقل پیغمبر اسلامؐ سے ہو یا دیگر انبیاء سے۔

حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں عصمت کا ثبوت

کچھ مصری مصنفین یہ ثابت کرناچاہاہے کہ شیعوں نے عدل خدااور عصمت جیسے کچھ عقاید معتزلہ سے حاصل کئے ہیں، جیسا کہ احمد امین نے ثابت کیاہے۔

لیکن یہ بھی بس ایک خیال پردازی ہے اور کچھ نہیں۔

اس لئے کہ بعض عقائد حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں بیان ہوئے ہیں جو معتزلہ اور شیعہ دونوں گروہوں میں مشترک ہیں۔

اگر معتزلہ کے یہاں کچھ عقائد مشترک پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ عقائد حضرت علی علیہ السلام سے اخذ کئے ہیں۔

اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ شیعوں نے اپنے عقائد معتزلہ سے حاصل کئے ہوں، جیسا کہ معلوم ہے معتزلہ فرقہ کی بنیاد واصل بن عطاء نے رکھی ہے جس کی پیدائش سن ۸۰ھ میں اور وفات ۱۳۱ھ میں واقع ہوئی ہے

احمد امین کا یہ نظریہ حقیقت میں بزرگان معتزلہ کے صریحی بیان کے مقابلہ میں ایک طرح کا اجتہاد ہے۔

وہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مذہب کو پوری طرح حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب کریں۔

کعبی جو اس فرقہ کے بزگوں میں شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ جو افتخار ہمارے فرقے کو حاصل ہے دیگر مذاہب کو حاصل نہیں ہے،

۱۔ سورہ نجم آیت ۱۱-۱۷

اس لئے کہ ہمارے مذہب کی تعلیمات واصل بن عطانے محمد حنفیہ اور ان کے بیٹے ابو ہاشم سے اخذ کی ہے اور انہوں نے اپنے والد حضرت علی علیہ السلام سے اخذ کیاہے اور حضرت علی علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔

اور کہتاہے کہ واصل بن عطا کی پرورش بھی محمد حنفیہ کے ہاتھوں انجام پائی واصل بن عطانے محمد حنفیہ کے بیٹے ابوہاشم کے ساتھ مدتوں ایک ہی مکتب میں علم حاصل کیا۔

یہی اعتراف علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغہ کے مقدمہ میں کیا ہے جہاں علم امام علی علیہ السلام کے بارے میں مفصل فصل قائم کی ہے۔

یہ حال فقط فرقہ معتزلہ کا نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے فکری آراامام علی علیہ السلام سے حاصل کئے ہیں بلکہ گروہ اشاعرہ کا بھی یہی حال ہے جو ابوالحسن علی بن اسماعیل کی طرف منسوب ہے، یہ لوگ بھی معتزلہ کے ذریعہ امام علی علیہ السلام تک پہنچتے ہیں، اس لئے کہ ابوالحسن اشعری قاضی ابو علی جبائی کا شاگرد ہے اور قاضی ابو علی جبائی معتزلہ کے بزرگان میں شمار ہوتے ہیں

اس اعتبار سے امام علی علیہ السلام دونوں فرقوں کے استاد قرار پاتے ہیں

ان تصریحات کے بعد احمد امین کا یہ نظریہ شیعوں پر بہتان ہے۔اور بس۔ کہ شیعوں نے اپنے عقائد معتزلہ سے اخذ کئے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کا مسئلہ امام علی علیہ السلام کے کلام میں صریحی طور پر ذکر ہوا ہے جیسا کہ ہم نمونہ کے طور پر یہاں ذکر کررہے ہیں:

""ولقد قرن اللہ بہ من لدن ان کافطیماً"

مسلم ہے کہ جو شخص بزرگترین فرشتہ الٰہی کے زیر نظر تربیت پائے وہ گناہ اور خطا سے پاک ہو گا۔

اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کو آپ نے اس طرح بیان فرمایاہے۔

ھم عیش العلم وموت الجھل۔۔۔

"ولایخالفون الحق" اس عبارت سے بہتر اور واضح تر عبارت اور کیاہو سکتی ہے جو پوری طرح اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کو ثابت کرتی ہے۔

اس لئے کہ مراد حق کی پیروی تمام مراحل میں ہے، مرحلہ عقیدہ وفکر، بیان وسخن، عمل وکردار۔

اور ظاہر ہے ایسے ہی شخص کو دین کی اصطلاح میں معصوم کہا جاسکتا ہے

جملہ "عقلوا الدین عقل وعایۃ ورعایۃ" پوری طرح سے یہ ثابت کر رہاہے کہ ال بیت معارف دین کو سمجھنے میں معصوم ہیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ روشن ہوگیا کہ عصمت کے موضوع سے دنیا کو وسیع طور پر آشنا کرانے والوں میں پہلے خود قرآن مجید ہے اور اسکے بعد بیانات امام علی علیہ السلام۔ اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ عصمت کا عقیدہ شیعوں میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام کے زمانے میں پیدا ہوا ہو۔

البتہ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ عصمت کے بارے میں دربار مامون میں امام علی رضا علیہ السلام کا علی بن جہم سے جو مناظرہ ہوا تھا اور آپ علیہ السلام نے عصمت کے اس مخالف کو عصمت کی حمایت میں بہترین جوابات عنایت فرمائے تھے تو اس سے عصمت کا موضوع اور بہتر طور پر دنیائے اسلام کے سامنے روشناس ہوا۔

اس لئے کہ امام علیہ السلام نے عصمت انبیاء کے دلائل اور مخالفین عصمت کے دلائل کا جواب پیش فرمایا ہے۔

حقیقت عصمت

گذشتہ اوراق پر ہم نے مسئلہ عصمت کی تاریخی حیثیت پیش کی، اور یہ واضح کیا کہ عصمت کے موضوع کو مفصل طور پر سب سے پہلے خود قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے عالمانہ بیانات نے۔

پھر ان دونوں کی روشنی میں علماء و متکلمین اسلام نے اس مسئلہ کو عنوان قرار دیا۔

چنانچہ فرقہ عدلیہ جو معتزلہ اور شیعہ دونوں کو شامل ہے، اس فرقہ نے تمام نبیوں کو معصوم تسلیم کیا۔

اور اس فرقہ کے مخالفین نے عصمت کے بارے میں اختلاف کیا اور الگ الگ تفصیلات بیان کیں جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ عصمت کے موضوع کو علماء علم کلام کے ذریعہ پختگی اور استحکام حاصل ہوا اور اس طرح عصمت کے مراحل اور عقلی اور قرآنی دلایل روشن ہوئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ امام رضا علیہ السلام کا علی بن جہم سے عصمت کے بارے میں جو مناظرہ ہوا اور اس مخالف عصمت نے قرآن کی وہ آیات پیش کیں جن آیات سے عدم عصمت انبیاء کی بو آتی ہے تو امام نے ان آیات کی صحیح تفسیر فرما کر اس کے تمام دلائل کا دندان شکن جواب دیا اور نتیجہ میں اس مخالف کو نہتا کر دیا۔

یہاں پر ہمارے لئے عصمت کے قرآنی اور عقلی دلائل کو پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ عصمت کی حقیقت کیا ہے جس میں کافی حد تک علماء کے اقوال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

چناچہ اہم نظریات مندرجہ ذیل ہیں:

الف: عصمت در حقیقت تقوا کی بلند ترین منزل کا نام ہے

اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ عصمت تقویٰ ہی کی بلند ترین منزل ہے لہٰذا ہر وہ ماہیت و حقیقت جو خود تقویٰ کی تصور کی جا سکتی ہے وہی حقیقت پوری طرح عصمت میں بھی پائی جاتی ہے۔

جس برح تقویٰ انسان کی ایک نفسانی حالت اور طاقت کا نام ہے جو اسے بہت سے گناہوں نے بچاتی ہے اسی طرح عصمت بھی ایک نفسانی طاقت ہے جو اسے برائیوں سے بچاتی ہے، حد یہ ے کہ برائیوں کے ارادے دے بھی بچاتی ہے۔

اسی بنیاد پر محققین نے عصمت کی درج ذیل تعریف کی ہے:

"قوۃتمنع الانسان عن اقتراف المعصیۃ والوقوع فی الخطا"

عصمت ایک نفسانی ملکہ ہے جو دیگر ملکات کی طرح اپنے مخصوص آثار سے ہر گز جدا نہیں ہو سکتا۔

جس طرح شجاعت، عفت اور سخاوت میں سے ہر ایک انسانی نفس کے لئے ملکہ اور ایک راسخ حالت کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے مخصوص ، آثار سے جدا نہیں ہو سکتا اسی طرح عصمت ہے کہ معصوم بھی پاکدامنی کی بلند ترین منزل پر فائز ہونے کی بنا پر گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔

اب رہا مسئلہ کہ یہ ملکہ اور یہ حالت معصوم میں کس طرح پیدا ہوتی ہے یہ بحث بعد میں کی جائے گی۔

عصمت نسبی اور عصمت مطلق

عصمت بہ طور مطلق اور گسترده طور پر، صرف انبیاء اور ائمہ سے مخصوص ہے لیکن عصمت نسبی یعنی بعض گناہوں سے حفاظت، یہ صرف انبیاء اور ائمہ سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے شریف انسان بھی اس عصمت سے آراستہ ہو سکتے ہیں۔

مثلاً بہت سے افراد برہنہ ہو کر سڑک پر نہ آتے ہیں اور نہ آنے کا ارادہ رکتے ہیں جو ایک گناہ کبیرہ ہے۔

اسی طرح بہت سے افراد چوری، قتل اور خودکشی جیسے گناہوں سے محفوظ ہیں، حتیٰ ان گناہوں کے بارے میں سوچتے بھی نہیں ہیں۔

عصمت نسبی کی اس تفصیل سے عصمت مطلق کی حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ عصمت مطلق، انسان کے نفس کی وہ باطنی حالت اور طاقت ہے جو اسے فکر اور رادہ گناہ سے بچاتی ہے چہ جائیکہ گناہ کا انجام دینا۔

اگر یہ حالت انبیاء اور ائمہ میں نہ ہو تو وہ بھی زیادہ سے زیادہ عام افراد بشر کی طرح ہو جائیں گے کہ جو صرف عصمت نسبی کے مالک ہیں، نہ کہ عصمت مطلق کے۔

ب: عصمت، گناہوں کے آثار کے علم کا نتیجہ ہے

بعض محققین کے نزدیک عصمت گناہوں کے انجام اور آثار سے آشنائی کا نتیجہ ہے، یہ علم ایسا ہے جو انسان کی دیگر قوتوں پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں اس علم سے مراد گناہ کے لوازم کا علم ہے، اور گناہ کے لوازم کا ہر علم بھی باعث عصمت نہیں ہوتا بلکہ علم کا وہ مرحلہ مراد ہے جس کے ائینہ میں گناہ کے آثار مجسم ہو جائیں جن کو مجسم دیکھ کر انسان گناہ کی فکر بھی نہیں کرتا۔

یہ نظریہ پہلے نظریہ سے منافات نہیں رکھتا ہے اور یہی نظریہ در حقیقت پہلے نظریہ کی بنیاد ہے، اسلئے کہ تقوا کی یہ بلند ترین منزل انسان کے لئے اسی صورت میں میسر ہے جب اسے گناہ کے مجسم آثار کا قطعی علم حاصل ہو، معصوم اپنی عصمت کے آئینہ میں گناہ کے آثار کو مجسم طور پر لمس کرتا ہے جس کی بنا پر وہ گناہ سے محفوظ ہوتا ہے وہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے اہل جنت کے درجات کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا اور آتش جہنم کی حرارت کو محسوس کرتا ہے جس کی بنا پر وہ گناہ سے محفوظ رہتا ہے، اسی بنا پر وہ اس آیت کا مصداق ہوتا ہے:

"كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ "

اس بنا پر پہلے نظریہ اور اس نظریہ میں پوری طرح مناسبت پائی جاتی ہے۔

ج: عصمت، در حقیقت اللہ کی صحیح معرفت کا نتیجہ ہے

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ معصوم چونکہ اس کی شناخت اور اللہ کے جمال و کمال کی معرفت اس کے یہاں بلند ترین مرتبہ پر ہویت ہے لہٰذا وہ اللہ کی مرضی کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا

اس کا عشق خدا اور عشق جمال خدا اسے گناہ کی اجازت نہیں دیتا وہ پوری طرح اللہ کی نعمتوں کا عرفان اور ان نعمتوں کے صحیح مصرف کا علم رکھتا ہے لہٰذا گناہ کی فکر بھی نہیں کرتا، انجام دینا تو دور کی بات ہے۔

ایسا شخص اللہ کی بارگاہ میں ان الفاظ میں گریہ کرتا ہوا نظر آتا ہے:

"ما عبدتک خوفاً من نارک و لا طمعاً فی جنتک بل وجدتک اهلاً للعباده"[1]

خدایا میں نے آتش جہنم کے خود یا تیری جنت کی لالچ میں تیری عبادت نہیں کی ہے بلکہ تجھے عبادت کا اہل پا کر عبادت کی ہے یعنی گویا بر بنائے معرفت۔

۱۔ حدیث منسوب بہ امام علی علیہ السلام، غوالی اللئالی، ج ۱ ص ۴۰۴

اب تک تینوں نظریے سے یہ ثابت ہوا کہ خواہ کسی بھی نظریہ کے اعتبار سے دیکھ لیا جائے عصمت کی حقیقت معصوم کے وجود کے اندر پائی جاتی ہے۔

لیکن نظریات کے مقابلہ میں بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عصمت کا سرچشمہ معصوم کی ذات کے بجائے امر کارجی ہے اور وہ روح القدس ہے جو اللہ والوں کو گناہ سے روک دیتا ہے۔

آیئے دیکھیں یہ نظریہ استحکام کی کس منزل میں ہے۔

د: عصمت کا مفہوم روح القدس کا گناہ سے روک دینا

اس نظریہ کے ذیل میں شیخ کلینیؒ نے کافی میں کتاب الحجۃ میں مستقل باب قائم کیا ہے "وہ روح جو ائمہ علیہم السلام کو لغزش اور گناہ سے بچاتی ہے[1]

اس باب کی روایت کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روح وہ جبرئیل نہیں ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی لے کر آتے تھے، بلکہ یہ طاقت جبرئیل سے بھی قوی ہے۔

اگرچہ روایات کے مطابق عصمت کا سرچشمہ ذات معصوم سے باہر روح القدس نامی طاقت ہے جو پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اور پھر ائمہ علیہم السلام کے ساتھ رہی ہے،

لیکن ان روایات کے مقابلہ میں دیگر روایات بھی ہیں جن کے مطابق یہ روح القدس معصوم کی ذات سے باہر نہیں ہے بلکہ خود معصومین کی ذات کے کمال کو ہی روح القدس کہتے ہیں یعنی پاک وپاکیزہ روح جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا گیا ہے ""[2] کہ سابقین اللہ کے رسول اور مخصوص بندے ہیں جن کے اندر پانچ طرح کی روح ہوتی ہے جو ان کی تائید اور حفاظت کرتی ہے:

"جعل فیھم خمسة ارواح:١۔ ایدھم بروح القدس فبه عرفوا الاشیاء،٢۔وایدھم بروح الایمان ،فبه خافوا الله عزوجل٣۔وایدھم بروح القوه فبه قدروا علی طاعة الله،٤۔وایدھم بروح الشھوه فبه اشتھوا طاعة الله عزوجل وکرھوا معصیته،٥۔وجعل فیھم روح المدرج الذی به یذھب الناس ویجیؤون "[3]

آخر کی چار ارواح، ذات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے باہر نہیں ہیں، اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ روح القدس خود نبی کے ذاتی اور نفسانی کمال کا نام ہے جو اسے گناہوں سے بچاتا ہے اور ہر لغزشوں کے منزل میں اس کی مدد کرتا ہے۔

۱۔ کافی، ج۱، کتاب حجت، باب "الروح التی یسدد اللہ بہ الائمہ علیہم السلام" ص ۲۷۳

۲۔ سورہ واقعی آیت ۱۰-۱۱

۳۔ کافی، ج۱ص ۲۷۲

اسی لئے شارحین اصول کافی (مثلاً ملا صالح مازندرانی) نے یہ احتمال دی اہے کہ ارواح سے مراد اس قسم کی احادیث میں "نفوس کاملہ "ہیں اس احتمال کی تائید کے لئے شیخ صدوقؒ کا یاک جملہ بھی پیش کیا ہے

پھر امام محمد باقر علیہ السلام جابر بن عبد اللہ انصاری سے فرماتے ہیں:

"یاجابر ان فی الانبیاء والاوصیاء خمسۃ ارواح "روح القدس" و "روح الایمان" و "روح الحیاۃ" و "روح القوۃ" و "روح الشھوۃ" فبروح القدس یا جابر عرفوا ما تحت العرش الی ما تحت الثری ثم قال: ان ھذہ الاربعۃ ارواح یصیبھا الحدثان الا روح القدس فانھا لا تلھوا و لا تلعب"[۱]

علامہ مجلسیؒ اس حدیث کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ممکن ہے ان پانچوں ارواح سے مراد انبیاء اور اولیاء کے نفوس کے مراتط اور درجات قدسی ہوں کہ ان کے نفوس جس طرح علم کے اعتبار سے چار مراتب میں تقسیم ہوتے ہیں: عقل ہیولانی، عقل بالملکہ، عقل بالفعل اور عقل مستفاد، اسی طرح ممکن ہے کہ روح ایمان اور روح القدس بھی انسانی نفس کے مراتب اور درجات ہوں اور روح حیات روح قوت اور روح شہوت روح حیوانی کے درجات ہوں۔

اسی طرح احتمال ہے کہ روح القدس کے علاوہ تمام ارواح انسانی نفس کے مراتب کا نام ہے اور روح القدس اللہ کا کوئی برا فرشتہ یا کوئی اور مخلوق ہے، اور ممکن ہے روح القدس انسان کا نفس ہی ہو لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لیاقت اور صلاحیت کی اس منزل پر ہو کہ بیرونی روح القدس سے مرتبط ہو جائے، جس طرح نفس ناطقہ عام افراد میں عقل مستفاد کہلاتا ہے جب اس کے اندر عقل بالفعل سے رابطہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور عقل بالفعل سے علوم حاصل کر سکے۔[۲]

ان احادیث میں دقت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پانچوں ارواح نفس نبوی کے مراتب ہیں اور ہر روح کا اپنا الگ ایک تقاضا ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ معصومین کے اندر الگ الگ پانچوں روحیں پائی جاتی ہوں۔

عصمت اور خطاو لغزش

گذشتہ تینوں تفسیریں عصمت کی، گناہوں کے اعتبار سے تھیں۔

اس لئے یہ بات صحیح ہے کہ گناہ کے مقابلہ میں عصمت ایک نفسانی کمال ہے اور ایک ملکہ روحی ہے جس طرح شجاعت اور عفت ہیں جو اپنی ضد کو اپنے اطراف سے دور کرتی ہیں، لیکن عصمت گناہوں کے مقابلے میں ہے، اور وہ بھی عمدی گناہ، لہٰذا یہ تینوں تفسیریں، خطا اور سہو او اشتباہ کے

۱۔ تعلیقات ملا صالح بر اصول کافی، ص۱۳۶، ط سنگی

۲۔ مرآۃ العقول، ج۳ ص۱۶۶

مقابلہ میں عصمت کا اثبات کرنے سے قاصر ہیں، خواہ وہ خطا شرعی امور میں ہو یا عرفی کاموں میں۔ سہو و خطا کے مقابلہ میں عصمت کا سرچشمہ گذشتہ تینوں تفاسیر میں بننے کی صلاحیت نہیں ہے، اس لئے کہ کوئی چوتھی تفسیر ضروری ہے۔

چنانچہ عصمت کی چوتھی تفسیر کی گئی جس نے معصومین کے لئے سہو و خطا کے مقابلہ میں بھی عصمت کو ثابت کر دیا، اور وہ تفسیر یہ ہے کہ "عصمت، معصوم پر اللہ کے اس مخصوص لطف کا نام ہے جسکے سایہ میں معصوم کا علم ہر لحہ غفلت سے محوظ رہتا ہے اور اشیاء کی حقیقی تصاویر کسی لحہ بھی اسکی فکر سے باہر نہیں ہوتیں جس کے نتیجے میں اس کا شعور وادراک کسی آن ب ھی خطا اور سہو ونساین میں مبتلا نہیں ہوتا۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تفسیر کے مطابق عصمت، در حقیقت معصوم کے خداداد وسیع علم کا نام ہے جس کے طفیل میں معصوم ہمیشہ دنیا اور اس کے حقائق کا عالم ہوتا ہے اور اسکا مضبوط علم کبھی غفلت کا شکار نہیں ہوتا۔

عصمت یعنی تائید روح القدس

سہو ونسیان کے مقابلہ میں عصمت کی تفسیر جس طرح معصوم کے وسیع علم سے ممکن ہے اسی طرح روح القدس کی تائید اور تقویت سے بھی یہ ممکن ہے۔ اور یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ روح قلدس سے متعلق گذشتہ تمام احادیث کو عصمت خطا ونسیان سے متعلق جانا جائے، جیسا کہ خود معصوم نے ارشاد فرمایا ہے: فبہ عرفوا الاشیاء "روح القدس کے ذریعہ معصوم کو حقائق اشیاء کا عرفان ہوتا ہے۔

لہٰذا عصمت کی تفسیر میں روح القدس کی تائید سے معصوم کا گناہوں سے محفوظ رہنا، یہ تفسیر در حقیقت وہی تفسیر ہے کہ معصوم اپنے اس علم کی روشنی میں گناہوں سے محفوظ رہتا ہے جس علم کے پاس سے بھی غفلت کا گذر نہیں ہے۔

اشاعرہ اور عصمت کی حقیقت

اب تک قرآن وسنت اور عقل کی روشنی میں عصمت کی حقیقت کو پیش کیا گیا

اب ایک نظر اشاعرہ کے نظریہ پر ڈالتے ہیں:

تفتازانی شرح عقائد نسفیہ 'میں لکھتے ہیں:

"العصمۃ ان لا یخلق اللّٰہ تعالیٰ الذنب فی العبد مع بقاء قدرتہ واختیارہ"

عصمت یہ ہے کہ خداوند عالم بندہ کی زندگی میں گناہ کو پیدا نہ کرے در حالیکہ بندہ گناہ پر قدرت اور اختیار رکھتا ہو

عصمت کی یہ تفسیر در حقیقت اللہ کی توحید (خالقیت کے اعتبار سے) کی غلط تفسیر کا نتیجہ ہے

۱۔ شرح عقائد نسفیہ، ص۱۸۵، طباعت آستانہ

اشاعرہ کا تصور یہ ہے کہ اللہ کی خلاقیت میں توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی خالقیت، خواہ وہ مستقل ہو یا غیر مستقل، اللہ کی ذات سے مخصوص ہے اور بندے صرف اللہ کے فعل وترک کے مظہر ہیں، ورنہ کسی بھی کام کے انجام پانے یا ترک میں بندوں کا مستقل کوئی کردار نہیں ہے، اسی تصور کا نتیجہ ہے جو تفتازانی نے عصمت کی تعریف میں یہ کہا کہ عصمت یہ ہے کہ خداوند عالم بندے کی زندگی میں گناہ کو پیدا نہ کرے۔

اگر اشاعرہ قرآن واحادیث میں غور کریں تو حقیقت روشن ہو جائے گی کہ توحید خالقیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صفحہ وجود پر اللہ کے علاوہ کوئی فاعل اور خالق نہیں ہے، نہ مستقل اور نہ غیر مستقل، اور بندے خود اپنے کاموں کو انجام نہیں دیتے ہیں بلکہ سب حقیقتاً اللہ کے آلہ کار ہوتے ہیں

بلکہ توحید خالقیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ صرف اصلی اور مستقل خالقیت اللہ کی ذات سے مخصوص ہے، ورنہ بندے بھی غیر مستقل خالقیت کے مالک ہیں کہ اللہ دی ہوئی قدرت سے اپنے کام انجام دیتے ہیں۔

چنانچہ تفتازانی کی تعریف عصمت کی اصلاح ہم اس طرح کرسکتے ہیں:

کہ عصمت یہ ہے کہ اللہ کا واقعی بندہ اپنی زندگی میں گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، نہ یہ کہ خدا اس کی زندگی میں گناہ پیدا نہ کرے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مصلح الدین کستلی (متوفی ۹۰۱) شرح عقائد نسفیہ کے حاشیہ میں عصمت کی فصیح ترین تعریف کو اہل سنت کے عقائد کے خلاف جانتے ہیں اور کہتے ہیں:

"واما تفسیرها بملکة تمنع عن الفجور فهو لا یستقیم علی اصول اهل السنة"[1]

یعنی عصمت کی یہ تفسیر کرنا کہ عصمت ایسا ملکہ اور کمال نفسانی ہے جو معصوم کو گناہوں سے روکتا ہے، یہ تفسیر اصول اہل سنت کے خلاف ہے۔

اس عبارت میں اہل سنت سے مراد اشاعرہ ہیں جو ظواہر قرآن و سنت کے بارے میں جمود کے قائل ہیں اور قرآن و سنت کے مضامین میں ظواہر سے ہٹ کر تجزیہ و تحلیل اور تفکر کے قائل نہیں ہیں۔

مکتب اشاعرہ اسی جمود فکری کی بنا پر بہت سے ایسے مسائل کو مسلمانوں کے عقائد میں شمار کرتا ہے جو عقل بشری اور منطق قرآن سے دور ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری نے کتاب "مقالات الاسلامیین" میں اہل حدیث اور اہل سنت کے عقائد کو بیان کیا ہے جن کے مطالعہ کے بعد تفتازانی کی بیان کردہ عصمت کی تعریف موجب تعجب نہ رہ جائے گی اس لئے کہ یہ ایک مخصوص مکتب ہے جس کا انداز فکر ہی جداگانہ ہے۔

۱۔ شرح عقائد نسفیہ کے ص ۱۸۴ کے حاشیہ کی طرف مراجعہ کریں

چنانچہ اس مکتب کا ایک نظریہ یہ ہے کہ بندوں کے گناہ اللہ پیدا کرتا ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اللہ آسمان کے نیچے آکر آواز دیتا ہے کہ کیا کوئی استغفار کرنے والا ہے جسے میں معاف کروں، پھر کہتا ہے کہ جمعہ و جماعت ہر نیک وبد کی اقتدا میں جائز ہیں۔

عصمت اللہ کا عطیہ ہے یا امر کسبی؟

عصمت کی حقیقت سے کسی حد تک آشنائی ہوگئی اور یہ معلوم ہوگیا کہ عصمت کا سرچشمہ در حقیقت معصوم کی روح میں پایا جاتا ہے، خواہ عصمت کی تفسیر گذشتہ تینوں تفاسیر میں سے کسی بھی تفسیر کے مطابق کی جائے۔

اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عصمت اللہ کا عطیہ ہے یا خود انسان کی اپنی کوشش اور تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عدالت اور تقوے کی بالاترین منازل انسان کی تحصیلی کوششوں سے وابستہ ہیں۔

لیکن گفتگو اس میں ہے کہ تقوا کی بالاترین منزل یا علم وشناخت کا کامل ترین مرتبہ چاہے وہ گناہوں کے انجام کا علم ہو یا خالق کی عظمت کا عرفان ہو آیا یہ مرتبہ معرفت ایک کسبی اور تحصیلی امر ہے یا عطائے خداوندی؟

متکلمین، عصمت کو ایک خدائی عطیہ جانتے ہیں جو اللہ کی طرف سے معصوم کی استعداد کی بناپر اسے عطا کیا جاتا ہے اور یہ مرتبہ قابل تحصیل نہیں ہے۔

شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں:

"العصمۃ تفضل من اللہ تعالیٰ علی من علم انہ یتمسک بعصمتہ"[1]

عصمت اللہ کی جانب سے بندہ پر فضل ہے جس کے بارے میں اللہ یہ جانتا ہے کہ لوگ اس سے اس کی عصمت کی بناپر وابستہ ہیں۔

دوسری جگہ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں: "عصمت اللہ کی ایک توفیق کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان ہر برائی سے محفوظ ہے، عصمت در حقیقت اس رسی کی طرح ہے جو انسان کو ڈوبنے سے بچاتی ہے"[2]

سید مرتضی بھی عصمت کو اللہ کا فضل و کرم جانتے ہیں:

"عصمت اللہ کا لطف ہے جو انسان کو برائیوں سے بچاتا ہے"[1]

۱۔ تصحیح الاعتقاد، ص۶۱

۲۔ ملحقات اوائل المقالات، ص۱۱۱

علامہ حلیؒ اور فاضل مقداد بھی عصمت کے عطیہ خدا ہونے کی تصریح کرتے ہیں علامہ حلہ فرماتے ہیں کہ عصمت لطف خدا ہے جس کے سبب انسان ترک واجب اور ارتکاب گناہ سے بچتا ہے [۲]

فاضل مقدادؒ فرماتے ہیں: "عصمت لطف خدا ہے جس کے ذریعہ انسان گناہ پر قادر ہوتے ہوئے بھی گناہ سے محفوظ ہے" [۳]

اسکے بعد وہ کچھ علماء سے نقل کرتے ہیں کہ "معصوم وہ ہے جس کی فطرت کو اللہ نے پاک وصاف اور اس کی طینت کو پاکیزہ پیدا کیا ہے، اسے اللہ نے قوی عقل سے نوازا ہے فکر سلیل دی ہے، اور بھی بہت سے الطاف سے نوازا ہے، وہ واجبات کی پابندی اور محرمات سے پرہیز کرتا ہے، اس کی توجہ ہمیشہ ملکوت اعلیٰ کی جانب ہوتی ہے، مادیات سے اس کی فکر آزاد ہوتی ہے، اس کے یہاں نفس امارہ مغلوب اور عقل کا غلبہ ہوتا ہے"

اشاعرہ کہتے ہیں کہ عصمت سے معصوم گناہوں پر اصلاً قادر ہی نہیں رہ جاتا ہے، گویا عصمت یعنی سلب قدرت، اس کے بارے میں ہم بعد میں بحث کریں گے۔

علامہ طباطبائیؒ عصمت کو علم کی ایک بلند ترین مزنل جانتے ہیں جو معصوم کو عطا ہوتی ہے۔

قرآن کی چند آیات بھی عصمت کے عطیہ خداوندی ہونے کی نشاندہی کرتی ہیں:

حضرت ابراہیم، اسحاق ویعقوب کے تذکرے کے بعد فرمایا:

"وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ ٱلْمُصْطَفَيْنَ ٱلْأَخْيَارِ " [۴]

یہ لوگ ہمارے نزدیک نیک اور منتخب لوگوں میں سے ہیں

دوسری آیت "وَلَقَدِ ٱخْتَرْنَـٰهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿٣٢﴾ " [۵]

ہم نے ان کا انتخاب علم کی بنا پر کیا ساری کائنات کے مقابلہ میں

۱۔ تکملہ امالی المرتضیٰ ج۲ص۳۴۷

۲۔ کشف المراد، ص۲۲۸

۳۔ اللوامع الالھیۃ، ص۱۶۹

۴۔ سورہ ص آیت ۴۷

۵۔ سورہ دخان آیت ۳۲

تیسری آیت:"إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذۡهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجۡسَ أَهۡلَ ٱلۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيرًا ﴿٣٣﴾ "[1]

یقیناً ہر قسم کی پلیدی اور رجس کا دور ہونا صرف عصمت کے عطا کرنے ممکن ہے، خصوصاً اس لئے کہ آیت میں ارادہ تکوینی ہے، نہ کہ تشریعی، جیسا کہ بعد میں آئے گا، اس کے علاوہ اور بھی آیات ہیں۔

دوسوال

۱)اگر عصمت اللہ کا خصوصی عطیہ ہے تو معصوم ہونا کوئی کمال اور باعث فخر چیز نہیں ہے؟

۲)معصوم عصمت کے ہوتے ہوئے گناہ پر قادر ہے یا نہیں یعنی آیا معصوم کا اختیار اور آزادی عصمت کی بناپر باقی رہتا ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پھر بھی عصمت کوئی کمال نہیں؟

ان دوسوالوں کے بارے میں تحقیق و بحث کرتے ہیں:

الف:عصمت اس اعتبار سے اللہ کا لطف ہے کہ ہر حال میں انسان کو نہیں دیا جاتا بلکہ اس لطف خدا کے لئے خود انسان میں استعداد کا ہونا ضروری ہے تاکہ اللہ اسے زیور عصمت سے آراستہ کرے۔

اس بارے میں کسی حد تک اختیار اور آزادی انسان کو حاصل ہے لیکن پوری طرح آزادی نہیں ہے۔

مثلاً بہت سے روحانی اور نفسانی صفات و کمالات جو انسان کی عصمت کا سبب بنتے ہیں وہ وراثت کے راستے سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں جیسا کہ جدید علوم نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، جس طرح انبیاء کے خاندانوں میں یہ صفات و کمالات اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

وراثت سے مراد بھی تنہا وراثت ہی نہیں ہے بلکہ تربیت بھی اسی کا حصہ ہے، اس لئے کہ بہت سے فضائل انسان کو تربیت کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

چنانچہ انبیاء کے خاندان اور آباء و اجداد میں وراثت اور تربیت دونو کے ہی راستے سے فضائل و کمالات کی کثرت دکھائی دیتی ہے، امانت ،شجاعت، ذہانت جیسے تمام کمالات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

وراثت اور تربیت دنوں عامل انسان کے اختیار سے باہر ہیں لیکن عصمت کی راہ ہموار کرتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر عوامل واسباب بھی ہیں جو عصمت کی راہ ہموار کرتے ہیں:

۱۔ سورہ احزاب ۳۳

۱-انفرادی اور اجتماعی جدوجہد: جیسا کہ حضرت ابراہیم ویوسف وموسیٰ اور بعثت سے قبل خود پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں دکھائی دیتی ہے، اس جدوجہد نے انبیاء کے یہاں عصمت کی استعداد پیدا کی انہوں نے اپنے نفس سے جہاد کیا، حرام سے چشم پوشی کی، سماج کی برائیوں کا مقابلہ کیا اگرچہ ہمیں فرداً فرداً ہر نبی کے بارے میں اس جدوجہد کی خبر نہیں ہے لیکن ان چند مثالوں سے حقیقت روشن ہے۔

۲۔ خود علم الٰہی ان کے مستقبل کے بارے میں ان کی عصمت کی راہ کو ہموار کرتا ہے ، اللہ یہ جانتا ہے کہ یہ حضرات اپنی رسالت کے دوران کس طرح کے کام انجام دیں گے ، اور سماج کی اصلاح کے لئے کون سے اقدامات کریں گے ، یہی وہ عوامل ہیں جن میں کچھ اختیاری ہیں اور کچھ غیر اختیاری ہیں اور مجموعی طور پر دونوں سبب ہوتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ عصمت کے زیور سے آراستہ کرے، انہیں اختیاری اسباب عصمت کی بنا پر عصمت، کمال اور باعث فخر چیز شمار ہوتی ہے۔

آخر میں ہمیں یہاں پر ایک نکتہ کا بیان کرنا ضروری ہے کہ عصمت کا پہلا مرحلہ جو بچپن سے ہی اولیاء الٰہی کو حاصل ہوتا ہے وہ مرحلہ خود ان کی ذاتی جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ نبوت سے پہلے کی جدوجہد عصمت کے بلند ترین مرحلہ میں داخلہ کا سبب ہوتی ہے اس حقیقت کو حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی زیارت کے ان جملوں سے بھی بہت حد تک سمجھا جاسکتا ہے:

"یا ممتحنة امتحنك الله الذی خلقك قبل ان یخلقك وكنت لما امتحنك به صابرة"

اے وہ ہستی جس کا پیدائش سے قبل ہی اللہ نے امتحان اور آزمائش کرلی ہو اور اس آزمائش میں تو نے اپنے صبر کا مظاہرہ کیا۔

اسی طرح دعائے ندبہ میں ہے:

"اولیائك الذین استخلصتهم لنفسك........بعد ان شرطت علیهم الزهد فی درجات هذه الدنیا الدنیة......فشرطوا لك ذالك وعلمت منهم الوفاء به"

اے خدا! جن اولیاء کو تو نے اپنے لئے برگزیدہ کیا تو اس سے پہلے تو ان کے لئے زہد و تقویٰ کی شرط لگادی اس پست دنیا میں، انہوں نے بھی تیری شرط کو تسلیم کیا اور تو بھی یہ جانتا تھا کہ یہ لوگ اپنی اس شرط پر عمل درآمد کریں گے، جب تو نے انہیں اپنے دین کے لئے برگزیدہ کیا۔

مذکورہ سوال اور سید مرتضیؒ کا جواب:

سید مرتضیؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ عصمت، لطف خدا ہے اور کچھ بندوں کے شامل حال ہوتا ہے لیکن پھر بھی قابل تعریف ہے، اس لئے کہ اللہ کے بندوں کی دو قسم ہے، کچھ وہ ہیں جو عصمت کی بنا پر پوری طرح آزاد رہ کر بھی گناہ سے بچتے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو اگر عصمت کے زیور سے آراستہ بھی کردیئے جائیں تو بھی گناہوں سے پرہیز نہیں کریں گے۔

اسی لئے عصمت فقط انہیں بندوں کو دی جاتی ہے جو عصمت لے کر گناہ پر قدرت رکھتے ہوئے بھی گناہ سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ گویا ان کے لئے ایک کمال اور باعث افتخار امر ہے۔[1]

سید مرتضیٰ کی یہ تقسیم اس وقت صحیح ہے جب عصمت کے لئے پہلے سے کوئی شرط نہ پائی جاتی ہو، لیکن اگر عصمت کے لئے پہلے سے کوئی شرائط کا وجود ضروری ہو تو پھر عصمت کا تعلق فقط ایک ہی گروہ سے ہوگا اور وہ وہ لوگ ہوں گے جو عصمت لے کر آزادی کے باوجود اور قدرت کے باوجود گناہوں سے پرہیز کریں۔

سید مرتضیٰ کا ایک نظریہ اور بھی ہے جو آج تک کسی سے نہیں سنا گیا اور وہ یہ ہے "اگر اللہ کسی کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ وہ عصمت لے کر گناہ سے پرہیز کرے گا اور اللہ کی اطاعت کرے گا تو اللہ پر واجب ہے کہ اسے عصمت عطا کرے خواہ وہ شخص نبی یا امام نہ ہو"[2]

اس نظریہ کی بناپر تو معصومین کو انبیاء اور ائمہ میں ہی منحصر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ممکن ہے کہ بہت سے افراد معصوم ہوں مگر نہ نبی ہوں اور نہ امام۔ یہ نظریہ مشہور متکلمین کے خلاف ہے۔

یہ تھا پہلے سوال کا جواب، اب ہم دوسرے سوال کا جواب پیش کرتے ہیں:

عصمت اور اختیار کی بحث

اگر عصمت اولیاء اللہ سے گناہ کی قدرت کو سلب کرلے تو پھر عصمت کوئی کمال اور باعث افتخار شے نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب بھی گذشتہ اوراق سے واضح ہو چکا ہے کہ عصمت کی چاہے ہم کوئی بھی تفسیر کرلیں خواہ اسے تقوے کی بلندترین منزل تصور کریں یا اسے گناہوں کے انجام اور آثار کا علم مانیں یا خود اللہ کی معرفت کی عظیم منزل تسلیم کرلیں کسی بھی صورت میں عصمت گناہ کی قدرت کے خاتمہ کا سبب نہیں بنتی، بلکہ انسان اپنے اختیار سے عمل کے طرفین میں سے کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی بھی عقلمند بجلی کے برہنہ تاروں کو مس نہیں کرے گا یا جذام اور ٹی بی کے بیمار کا بچا ہوا کھانا نہیں کھائے گا، لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ اس پر قادر بھی نہ ہو وہ قادر ہے صرف اس کام کے انجام سے آشنائی کی بناپر وہ ترک کو ناجام پر ترجیح دیتا ہے، لیکن انجام نہ دینا ایک الگ کام ہے اور قدرت نہ رکھنا ایک الگ مسئلہ ہے۔

گویا عقلمند انسان کے لئے مذکورہ کام محال عادی کی شکل اختیار کرچکے ہیں، لیکن محال عقلی نہیں ہیں۔

۱۔ امالی سید مرتضیٰ ج۲ص۷ ۴۴-۴۴۸

۲۔ گذشتہ حوالہ

اور محال عادی اور محال عقلی کا فرق روشن ہے کہ پہلے میں عمل کا انجام دینا ممکن ہے اگر چہ عمل کا تحقق نہیں ہوتا لیکن محال عقلی میں اصلاً کام کا انجام دیناہی ناممکن ہے، بطور مثال اللہ نیک لوگوں کو جہنم میں بھیج سکتا ہے اور برے لوگوں کو جنت میں بھیج سکتا ہے لیکن ایسا کرے گا نہیں، اس لئے کہ ایسا کرنا حکمت وعدالت کے خلاف ہے۔

اسی طرح معصوم ہے کہ وہ گناہ کے انجام اور واجب کے ترک پر قادر ہے مگر عصمت کی روشنی میں وہ ایسا کرنے سے باز رہتا ہے۔

قرآن مجید اور ہمارا دعویٰ

مندرجہ ذیل آیات ہمارے اس دعوے کی تائید کرتی ہیں:

۱)"وَمِنْ ءَابَآئِهِمْ وَذُرِّيَّـٰتِهِمْ وَإِخْوَٰنِهِمْ ۖ وَٱجْتَبَيْنَـٰهُمْ وَهَدَيْنَـٰهُمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ذَٰلِكَ هُدَى ٱللَّهِ يَهْدِى بِهِۦ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا۟ لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ "

اگر معصوم گناہ کے انجام پر قادر وہتا تو آیت میں یہ جملہ بے معنی ہوجاتا "وَلَوْ أَشْرَكُوا۟ لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ "کہ یہ جملہ معصوین کے ہی بارے میں ہے۔

اس لئے کہ فرض یہ ہے کہ معصوم شرک وغیرہ کسی بھی گناہ پر قدر نہیں ہے(اشاعرہ کے نزدیک)

۲)آیہ بلاغ:"يَـٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ ٱلنَّاسِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَـٰفِرِينَ "

:اے رسول! جو تم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوچکا ہے اسے پہونچادو، اگر تم نے انجام نہ دیا تو گویااللہ کے پیغام کو نہیں پہونچایا۔

یہ آیت صریحاً یہ بتارہی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی نافرمانی پر قدرت رکھتے ہیں، اور عصمت کے باوجود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسالت کے ترک کرنے پر قادر ہیں۔

گذشتہ دونوں سوالوں کے جوابات روشن اور واضح ہوجانے کے بعد اب ہم عصمت انبیاء کے بارے میں متکلمین کے نظریات اور اختلافات کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور عقل اور قرآنی دلائل سے عصمت انبیاء کا اثبات کرنا چاہتے ہیں۔

عصمت کے مراحل اور دلائل

متعلق آیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱. صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ (سورہ حمد)

۲. كَانَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ ٱلنَّاسِ فِيمَا ٱخۡتَلَفُواْ فِيهِۚ (سورہ بقرہ ۲۱۳)

۳. أَمۡ حَسِبۡتُمۡ أَن تَدۡخُلُواْ ٱلۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَأۡتِكُم مَّثَلُ ٱلَّذِينَ خَلَوۡاْ مِن قَبۡلِكُمۖ مَّسَّتۡهُمُ ٱلۡبَأۡسَآءُ وَٱلضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُواْ حَتَّىٰ يَقُولَ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ مَتَىٰ نَصۡرُ ٱللَّهِۗ أَلَآ إِنَّ نَصۡرَ ٱللَّهِ قَرِيبٌ (سورہ بقرہ ۲۱۴)

۴. قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾ (سورہ آل عمران آیت ۳۱)

۵. وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ فَأُوْلَٰٓئِكَ مَعَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ وَٱلصِّدِّيقِينَ وَٱلشُّهَدَآءِ وَٱلصَّٰلِحِينَۚ وَحَسُنَ أُوْلَٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾ (سورہ نساء آیت ۶۹)

۶. وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ ﴿٦٤﴾ (سورہ نساء آیت ۶۴)

۷. مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدۡ أَطَاعَ ٱللَّهَۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيظًا ﴿٨٠﴾ (نساء ۸۰)

۸. يَعِدُهُمۡ وَيُمَنِّيهِمۡۖ وَمَا يَعِدُهُمُ ٱلشَّيۡطَٰنُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾ (نساء ۱۲۰)

۹. أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُۖ فَبِهُدَىٰهُمُ ٱقۡتَدِهۗ قُل لَّآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ أَجۡرًاۖ إِنۡ هُوَ إِلَّا ذِكۡرَىٰ لِلۡعَٰلَمِينَ ﴿٩٠﴾ (سورہ انعام آیت ۹۰)

۱۰. وَٱجۡتَبَيۡنَٰهُمۡ وَهَدَيۡنَٰهُمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسۡتَقِيمٍ ﴿٨٧﴾ (سورہ انعام آیت ۸۷)

۱۱. وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِىٓ إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ ٱلْقُرَىٰٓ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ فَيَنظُرُوا۟ كَيْفَ كَانَ عَـٰقِبَةُ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ ٱلْـَٔاخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾ (سورہ یوسف آیت۱۰۹)

۱۲. حَتَّىٰٓ إِذَا ٱسْتَيْـَٔسَ ٱلرُّسُلُ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا۟ جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّىَ مَن نَّشَآءُ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ ٱلْقَوْمِ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿١١٠﴾ (سورہ یوسف آیت۱۱۰)

۱۳. وَمَآ أَكْثَرُ ٱلنَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ (سورہ یوسف آیت۱۰۳)

۱۴. وَقَالَ ٱلشَّيْطَـٰنُ لَمَّا قُضِىَ ٱلْأَمْرُ إِنَّ ٱللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ ٱلْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِىَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَـٰنٍ إِلَّآ أَن دَعَوْتُكُمْ فَٱسْتَجَبْتُمْ لِى ۖ فَلَا تَلُومُونِى وَلُومُوٓا۟ أَنفُسَكُم ۖ ...... ﴿٢٢﴾ (سورہ ابراہیم آیت۲۲)

۱۵. قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِى لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾ (سورہ حجر آیت۳۹/۴۰)

۱۶. إِنَّ عِبَادِى لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَـٰنٌ إِلَّا مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْغَاوِينَ (سورہ حجر آیت۴۲و سورہ اسرا آیت۶۵)

۱۷. أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَٱجْتَبَيْنَآ ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتُ ٱلرَّحْمَـٰنِ خَرُّوا۟ سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ (سورہ مریم آیت۵۸)

۱۸. فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُوا۟ ٱلشَّهَوَٰتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ (سورہ مریم آیت۵۹)

۱۹. وَذَا ٱلنُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَـٰضِبًا فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِى ٱلظُّلُمَـٰتِ أَن لَّآ إِلَـٰهَ إِلَّآ أَنتَ سُبْحَـٰنَكَ إِنِّى كُنتُ مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٨٧﴾ (سورہ انبیاء۸۷)

۲۰. وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلْقَى ٱلشَّيْطَٰنُ فِىٓ أُمْنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ ٱللَّهُ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٢﴾ (سورہ حج آیت ۵۲)

۲۱. لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَٱلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ لَفِى شِقَاقٍۭ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾ (سورہ حج آیت ۵۳)

۲۲. وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا۟ بِهِۦ فَتُخْبِتَ لَهُۥ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ ٱللَّهَ لَهَادِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٤﴾ (سورہ حج آیت ۵۴)

۲۳. لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ.....(سورہ حج آیت ۵۳)

۲۴. وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ.......... (سورہ حج آیت ۵۴)

۲۵. وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَخْشَ ٱللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ ﴿٥٢﴾ (سورہ نور آیت ۵۲)

۲۶. ...... فَلَيَعْلَمَنَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ صَدَقُوا۟ وَلَيَعْلَمَنَّ ٱلْكَٰذِبِينَ ﴿٣﴾ (سورہ عنکبوت آیت ۳)

۲۷. لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِى رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلْيَوْمَ ٱلْءَاخِرَ وَذَكَرَ ٱللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾ (سورہ احزاب آیت ۲۱)

۲۸. ۞ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ ٱعْبُدُونِى ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا۟ تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾ (سورہ یس آیت ۶۰-۶۲)

۲۹. قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾ (سورہ ص آیت ۸۲-۸۳)

۳۰. وَٱذْكُرْ عِبَٰدَنَآ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ أُو۟لِى ٱلْأَيْدِى وَٱلْأَبْصَٰرِ ﴿٤٥﴾ إِنَّآ أَخْلَصْنَٰهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى ٱلدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ ٱلْمُصْطَفَيْنَ ٱلْأَخْيَارِ ﴿٤٧﴾ وَٱذْكُرْ إِسْمَٰعِيلَ وَٱلْيَسَعَ وَذَا ٱلْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ ٱلْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾ (سورہ ص آیت ۴۵-۴۸)

۳۱. قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾ (سورہ ص آیت ۸۲-۸۳)

۳۲. أَلَيْسَ ٱللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُۥ ۖ وَيُخَوِّفُونَكَ بِٱلَّذِينَ مِن دُونِهِۦ ۚ وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِنْ هَادٍ ﴿٣٦﴾ وَمَن يَهْدِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِن مُّضِلٍّ ۗ أَلَيْسَ ٱللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِى ٱنتِقَامٍ ﴿٣٧﴾ (سورہ زمر آیت ۳۶-۳۷)

۳۳. إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ ٱلْأَشْهَـٰدُ ﴿٥١﴾ (سورہ غافر آیت ۵۱)

۳۴. وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ ٱللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِى كَثِيرٍ مِّنَ ٱلْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ ......﴿٧﴾ (سورہ حجرات آیت ۷)

۳۵. وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْىٌ يُوحَىٰ ﴿٤﴾ (سورہ نجم آیت ۳-۴)

۳۶. أَفَرَءَيْتُمُ ٱللَّـٰتَ وَٱلْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ ٱلثَّالِثَةَ ٱلْأُخْرَىٰٓ ﴿٢٠﴾ (سورہ نجم آیت ۱۹-۲۰)

۳۷. أَلَكُمُ ٱلذَّكَرُ وَلَهُ ٱلْأُنثَىٰ ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰٓ ﴿٢٢﴾ إِنْ هِىَ إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَـٰنٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَمَا تَهْوَى ٱلْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ ٱلْهُدَىٰٓ ﴿٢٣﴾ (سورہ نجم آیت ۲۱-۲۳)

۳۸. إِنْ هِىَ إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم.......(سورہ نجم آیت ۲۳)

۳۹. وَأَنَّهُۥٓ أَهْلَكَ عَادًا ٱلْأُولَىٰ ﴿٥٠﴾ وَثَمُودَا۟ فَمَآ أَبْقَىٰ ﴿٥١﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ ﴿٥٢﴾ (سورہ نجم آیت ۵۰-۵۲)

۴۰. وَإِنِّى كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوٓا۟ أَصَـٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِمْ وَٱسْتَغْشَوْا۟ ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا۟ وَٱسْتَكْبَرُوا۟ ٱسْتِكْبَارًا ﴿٧﴾ ثُمَّ إِنِّى دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿٨﴾ ثُمَّ إِنِّىٓ أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ﴿٩﴾ (سورہ نوح آیت ۷-۹)

۴۱. عَـٰلِمُ ٱلْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِۦٓ أَحَدًا ﴿٢٦﴾ (سورہ جن آیت ۲۶)

۴۲. إِلَّا مَنِ ٱرۡتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُۥ يَسۡلُكُ مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهِۦ رَصَدٗا ﴿٢٧﴾

(سورہ جن آیت ۲۷)

۴۳. لِّيَعۡلَمَ أَن قَدۡ أَبۡلَغُواْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّهِمۡ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيۡهِمۡ وَأَحۡصَىٰ كُلَّ شَيۡءٍ عَدَدَۢا ﴿٢٨﴾

(سورہ جن آیت ۲۸)

آیات

۱. جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں ان کا راستہ نہیں جن پر غضب نازل ہوا ہے یا جو بہکے ہوئے ہیں

۲. (فطری اعتبار سے) سارے انسان ایک قوم تھے. پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں اور اصل اختلاف ان ہی لوگوں نے کیا جنہیں کتاب مل گئی ہے اور ان پر آیات واضح ہو گئیں صرف بغاوت اور تعدی کی بنا پر تو خدا نے ایمان والوں کو ہدایت دے دی اور انہوں نے اختلافات میں حکم الٰہی سے حق دریافت کر لیا اور وہ تو جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت دے دیتا ہے

۳. کیا تمہارا خیال ہے کہ تم آسانی سے جنّت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ ابھی تمہارے سامنے سابق اُمتوں کی مثال پیش نہیں آئی جنہیں فقر و فاقہ اور پریشانیوں نے گھیر لیا اور اتنے جھٹکے دیئے گئے کہ خود رسول اور ان کے ساتھیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آخر خدائی امداد کب آئے گی. تو آگاہ ہو جاؤ کہ خدائی امداد بہت قریب ہے

۴. اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو- خدا بھی تم سے محبّت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا کہ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے

۵. اور جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن پر خدا نے نعمتیں نازل کی ہیں انبیاء صدیقین, شہداء اور صالحین اور یہی بہترین رفقاء ہیں

۶. اور ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا ہے مگر صرف اس لئے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے

۷. جو رسول کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی

۸. شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے اور وہ جو بھی وعدہ کرتا ہے وہ دھوکہ کے سوا کچھ نہیں ہے

۹. یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے لہٰذا آپ بھی اسی ہدایت کے راستہ پر چلیں اور کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اس کار تبلیغ و ہدایت کا کوئی اجر نہیں چاہتے ہیں یہ قرآن تو عالمین کی یاد دہانی کا ذریعہ ہے

۱۰. اور خود انہیں بھی منتخب کیا اور سب کو سیدھے راستہ کی ہدایت کر دی

۱۱۔ اور ہم نے آپ سے پہلے ان ہی مردوں کو رسول بنایا ہے جو آبادیوں میں رہنے والے تھے اور ہم نے ان کی طرف وحی بھی کی ہے تو کیا یہ لوگ زمین میں سیر نہیں کرتے کہ دیکھیں کہ ان سے پہلے والوں کا انجام کیا ہوا ہے اور دا» آخرت صرف صاحبانِ تقوٰی کے لئے بہترین منزل ہے - کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ہو

۱۲۔ یہاں تک کہ جب ان کے انکار سے مرسلین مایوس ہونے لگے اور ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا ہے تو ہماری مدد مرسلین کے پاس آگئی اور ہم نے جن لوگوں کو چاہا انہیں نجات دے دی اور ہمارا عذاب مجرم قوم سے پلٹایا نہیں جاسکتا ہے

۱۳۔ اور آپ کسی قدر کیوں نہ چاہیں انسانوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے

۱۴۔ اور شیطان تمام امور کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کہے گا کہ اللہ نے تم سے بالکل برحق وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا پھر میں نے اپنے وعدہ کی مخالفت کی اور میرا تمہارے اوپر کوئی زور بھی نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اسے قبول کر لیا تو اب تم میری ملامت نہ کرو بلکہ اپنے نفس کی ملامت کرو کہ نہ میں تمہاری فریادرسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو میں تو پہلے ہی سے اس بات سے بیزار ہوں کہ تم نے مجھے اس کا شریک بنا دیا اور بیشک ظالمین کے لئے بہت بڑا دردناک عذاب ہے

۱۵۔ اس نے کہا کہ پروردگار جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں ان بندوں کے لئے زمین میں ساز و سامان آراستہ کروں گا اور سب کو اکٹھا گمراہ کروں گا ، علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص بنالیا ہے

۱۶۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی اختیار نہیں ہے علاوہ ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کرنے لگیں

۱۷۔ یہ سب وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے نعمت نازل کی ہے ذرّیت آدم میں سے اور ان کی نسل میں سے جن کو ہم نے نوح علیہ السّلام کے ساتھ کشتی میں اٹھایا ہے اور ابراہیم علیہ السّلام و اسرائیل علیہ السّلام کی ذرّیت میں سے اور ان میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی ہے اور انہیں منتخب بنایا ہے کہ جب ان کے سامنے رحمان کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں

۱۸۔ پھر ان کے بعد ان کی جگہ پر وہ لوگ آئے جنہوں نے نماز کو برباد کر دیا اور خواہشات کا اتباع کر لیا پس یہ عنقریب اپنی گمراہی سے جاملیں گے

۱۹۔ اور یونس علیہ السّلام کو یاد کرو کہ جب وہ غصّہ میں آکر چلے اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر روزی تنگ نہ کریں گے اور پھر تاریکیوں میں جاکر آواز دی کہ پروردگار تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے تو پاک و بے نیاز ہے اور میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے تھا

۲۰۔ اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا ہے کہ جب بھی اس نے کوئی نیک آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی تو پھر خدا نے شیطان کی ڈالی ہوئی رکاوٹ کو مٹا دیا اور پھر اپنی آیات کو مستحکم بنا دیا کہ وہ بہت زیادہ جاننے والا اور صاحبِ حکمت ہے

۲۱. تا کہ وہ شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لئے آزمائش بنادے جن کے قلوب میں مرض ہے اور جن کے دل سخت ہو گئے ہیں اور ظالمین یقینا بہت دور رس نافرمانی میں پڑے ہوئے ہیں

۲۲. اور اس لئے بھی کہ صاحبانِ علم کو معلوم ہو جائے کہ یہ وحی پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور اس طرح وہ ایمان لے آئیں اور پھر ان کے دل اس کی بارگاہ میں عاجزی کا اظہار کریں اور یقینا اللہ ایمان لانے والوں کو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والا ہے

۲۳. تا کہ وہ شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لئے آزمائش بنادے جن کے قلوب میں مرض ہے......

۲۴. اور اس لئے بھی کہ صاحبانِ علم کو معلوم ہو جائے کہ یہ وحی پروردگار کی طرف سے برحق ہے......

۲۵. اور جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا اور اس کے دل میں خوف خدا ہو گا اور وہ پرہیز گاری اختیار کرے گا تو وہی کامیاب کہا جائے گا

۲۶. ....اور اللہ تو بہر حال یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں

۲۷. مسلمانو! تم میں سے اس کے لئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ عمل ہے جو شخص بھی اللہ اور آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے

۲۸. اولاد آدم کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبر دار شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ؛اور میری عبادت کرنا کہ یہی صراط مستقیم اور سیدھا راستہ ہے؛ اس شیطان نے تم میں سے بہت سی نسلوں کو گمراہ کر دیا ہے تو کیا تم بھی عقل استعمال نہیں کروگے

۲۹. ....تو پھر تیری عزّت کی قسم میں سب کو گمراہ کروں گا ؛علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تونے خالص بنالیا ہے

۳۰. اور پیغمبر علیہ السّلام ہمارے بندے ابراہیم علیہ السّلام, اسحاق علیہ السّلام اور یعقوب علیہ السّلام کا ذکر کیجئے جو صاحبانِ قوت اور صاحبانِ بصیرت تھے ہم نے ان کو آخرت کی یاد کی صفت سے ممتاز قرار دیا تھا اور وہ ہمارے نزدیک منتخب اور نیک بندوں میں سے تھے اور اسماعیل علیہ السّلام اور الیاس علیہ السّلام اور ذوالکفل علیہ السّلام کو بھی یاد کیجئے اور یہ سب نیک بندے تھے۔

۳۱. ....تو پھر تیری عزّت کی قسم میں سب کو گمراہ کروں گا ؛علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تونے خالص بنالیا ہے

۳۲. ....حالانکہ جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دے اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے * اور جس کو وہ ہدایت دیدے اس کا کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے کیا خدا سب سے زیادہ زبردست انتقام لینے والا نہیں ہے

۳۳. بیشک ہم اپنے رسول اور ایمان لانے والوں کی زندگانی دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں..........................

۳۴. اور یاد رکھو کہ تمہارے درمیان خدا کا رسول موجود ہے یہ اگر بہت سی باتوں میں تمہاری بات مان لیتا تو تم زحمت میں پڑ جاتے.............

۳۵. رسول اپنی خواہشوں سے بولتا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا کلام محض وحی ہوتا ہے

۳۶. کیا تم نے لات و عزیٰ کو دیکھا ہے اور تیسرے بت منات کو

۳۷. کیا بیٹے تمہارے اور بیٹیاں اللہ کی ہیں، یہ تو ظالمانہ تقسیم ہے۔ یہ وہ نام ہیں جو تم نے اور تماہرے باپ دادانے طے کر لئے ہیں خدا نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نہیں نازل کی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ صرف اپنے گمانوں کا اتباع کر رہے ہیں اور جو کچھ ان کا دل چاہتا ہے اور یقیناًان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔

۳۸. یہ سب وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادانے رکھ لئے ہیں

۳۹. اور اسی نے پہلے قوم عاد کو ہلاک کیا ہے، اور قوم ثمود کو بھی پھر کسی کو باقی بھی نہیں چھوڑا ہے اور قوم نوح کو ان سے پہلے کہ وہ لوگ بڑے ظالم اور سرکش تھے۔

۴۰. اور میں نے جب بھی انہیں دعوت دی کہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے اپنی انگلیوں کو کانوں میں رکھ لیا اور اپنے کپڑے اوڑھ لئے اور اپنی بات پر شدت سے اکڑ گئے پھر میں نے انہیں علی الاعلان دعوت دی پھر میں نے اعلان بھی کیا اور خفیہ طور سے بھی دعوت دی

۴۱. وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ہے۔

۴۲. مگر جس رسول کو پدند کرلے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے

۴۳. مگر جس رسول کو پسند کرلے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے

۴۴. تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہونچا دیا ہے اور وہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے اس پر حاوی ہے اور سب کے اعداد کا حساب رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

عصمت سے متعلق مقدماتی گفتگو تمام ہوگئی، عصمت کی ماہیت اور حقیقت واضح ہوگئی، اسی طرح عصمت کا منبع اور سرچشمہ بھی واضح ہوگیا ، یہ بھی عرض کیا گیا کہ عصمت ایک کمال اور باعث افتخار شے ہے جو اللہ کی جانب سے مخصوص بندوں کو عطا ہوتی ہے، اور عصمت سے گناہ کی قدرت کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

اب ہم عصمت کے درجات اور اس کے لئے عقلی اور قرآنی دلائل پیش کرتے ہیں:

عصمت کے درجات حسب ذیل ہیں:

۱۔ وحی خدا کے حاصل کرنے میں عصمت

۲۔ دین کے اصول اور فروع کی تبلیغ میں عصمت

۳۔ گناہوں سے حفاظت، محرمات کے انجام اور ترک واجب میں مذکورہ امور کے علاوہ سہو وخطا میں عصمت، مثلاً کسی چیز کی تشخیص میں دھوکہ کھانا، خطا کرنا وغیرہ، اپنی زندگی کے عادی امور میں خطا کرنا۔

عصمت کے انہیں درجات کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے، کہ عصمت یا کفر کے مقابلہ میں ہے یا گناہ کے مقابلہ میں، گناہ بھی یا کبیرہ یا صغیرہ، گناہ صغیرہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے:

کبھی فاعل کی طبیعت کی پستی اور سماج کی نفرت کی نشاندہی کرتا ہے جیسے ایک لقمہ غذا کی چوری کرنا اور کبھی ایسا نہیں ہے جیسے بدزبانی، اسی طرح کبھی تو گناہ عمداً ہوتا ہے اور کبھی سہواً، اسی طرح عصمت کبھی تو بعثت سے پہلے مقصود ہوتی ہے اور کبھی بعد میں۔

کفر کے بارے میں علماء علم کلام میں کوئی بھی انبیاء کے لئے کفر کو جائز اور ممکن نہیں سمجھتا۔

اگر مسلمان کا ایک گروہ جو " اَزارِقہ " کہلاتا ہے کفر کو انبیاء کے لئے ممکن سمجھتا ہے تو ان کی مراد کفر سے کفر اصطلاحی یعنی خالق کا انکار اور شرک نہیں ہے بلکہ مراد گناہ کا امکان ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مکتب فکر میں ہر گناہ کبیرہ کو کفر کہتے ہیں، اور ان کے یہاں عاصی اور کافر مترادف ہیں، لہٰذا امکان کفر سے مراد ان کے نزدیک امکان معصیت ہے۔[1]

علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفیہ کے صفحہ ۱۷۱ پر شیعوں کی جانب یہ نسبت دی ہے کہ "شیعہ حرات تقیہ کی بنا پر انبیاء کے لئے جائز سمجھتے ہیں کہ کفر کا اظہار کریں" اس سلسلہ میں انہوں نے کسی ماخذ کو کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جبکہ شیعہ عقائد میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی، اس لئے کہ تقیہ انبیاء کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے، اس لئے کہ انبیاء کفر وشرک ونفاق کی بنیادوں کو متزلزل کرنے اور ان کے استیصال کے لئے مبعوث ہوتے ہیں، لہٰذا اپنی جان کے تحفظ کی خاطر انبیاء اپنی رسالت کا انکار اور کفر کا مظاہرہ ہرگز نہیں کرسکتے۔

بہر حال عصمت کے مراحل کو خواہ پہلی صورت میں بیان کریں یا دوسری شکل میں، خود قرآن مجید انبیاء کی عصمت کے دو مرحلوں کی صراحت کے ساتھ گواہی دیتا ہے، ایک اخذ وحی اور دوسرے تبلیغ رسالت، اور اس بارے میں کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا ہے

اہم مسئلہ تیسرا مرحلہ اور پھر چوتھا مرحلہ ہے، یعنی گناہوں کے مقابلہ میں عصمت اور پھر زندگی کے عام کاموں میں یا خیر وصلاح اور فائدہ و نقصان کی تشخیص میں سہو وخطا کے مقابلہ میں عصمت۔

۱۔ شرح تجرید قوشجی، ص ۴۶۴

شیعہ عقائد کے مطابق انبیاء گناہوں کے ساتھ ساتھ سہو وخطا سے بھی دور ہوتے ہیں بعثت سے پہلے بھی اور اسکے بعد بھی، گناہ بھی خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، عمداً ہو یا سہواً، ہر قسم سے پاک ہوتے ہیں۔

صرف شیخ مفیدؒ کا نظریہ یہ ہے کہ اگر گناہ صغیرہ طبیعت کی خفت کی بناپر نہ ہو تو بعثت سے پہلے انبیاء کے لئے ممکن ہے لیکن سہوا[۱]

عصمت انبیاء کے بارے میں علماء اہل سنت کے درمیان خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جس کی تفصیلات سے پرہیز کرتے ہوئے خلاصہ نقل کیا جارہا ہے:

حشویہ کے نزدیک انبیاء بعثت کے بعد بھی گناہ کبیرہ انجام دے سکتے ہیں

اشاعرہ کے محققین کا ایک گروہ گناہان کبیرہ اور صغیرہ کو جو خفت طبع کی نشاندہی کریں بعثت کے بعد ناممکن جانتے ہیں لیکن بعثت کے بعد گناہ صغیرہ کو اگر خفت طبع کی نشاندہی نہ کرے تو سہواً ممکن جانتے ہیں۔

لیکن انہیں اشاعرہ کا یاک دوسرا گروہ اور معتزلہ میں ابوہاشم گناہ صغیرہ کو ممکن جانتے ہیں خواہ عمداً ہو یا سہواً، سماج کی نفرت کا سبب ہو یا نہ ہو۔[۲]

قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب "المغنی میں معتزلہ کے عقیدہ کی دوسری طرح تشریح کی ہے، جس کی طرف ضرورت مند حضرات مراجعہ کرسکتے ہیں۔

یہ تھے علماء کے نظریات عصمت انبیاء کے بارے میں۔

ہمیں اب اس بارے میں یہ دیکھنا ہے کہ عقل اور قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔

عصمت، تبلیغ شریعت میں

سب سے پہلے ہم اخذ وحی اور تبلیغ شریعت میں انبیاء کی عصمت عقلی دلائل سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

عصمت کے بغیر نبیؐ کی گفتار پر بھروسہ کرنا ممکن نہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں میں ایمان پیدا کرنا اور پھر اس کے بعد انہیں الٰہی پروگراموں سے آشنا بنانا ہے

۱۔ اوائل المقالات، ص ۳

۲۔ شرح تجرید قوشچی، ص ۴۶۴

اس لئے ضرورت ہے کہ انسان مطمئن ہو کہ نبیؐ جو کہہ رہاہے وہ اللہ کی جانب سے کہہ رہاہے اور یقین ہو کہ انبیاء اخذ وحی اوت تبلیغ میں سہو او خطا کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں ورنہ بعثت کا مقصد پورا حاصل نہ ہو گا۔

قاضی عبد الجبار نے المغنی کی ج۱۵ ص۳۰۳ میں اس دلیل کو تسلیم کیاہے، خواجہ نصیر الدین طوسی نے تجرید میں خلاصۃً اس دلیل عقل کی جانب اشارہ کیاہے:

"ویجب فی النبی العصمۃ لیحصل الوثوق بافعالہ واقوالہ ویحصل الغرض من البعثۃ وھو متابعۃ المبعوث الیھم لہ"

انبیاء میں عصمت کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کے افعال واقوال کالوگوں کے دلوں میں اطمینان اور اعتماد پیدا ہو اور نتیجتاً لوگ ان کا اتباع کریں، جو بعثت انبیاء کا اصلی ہدف ہے۔

اس دلیل عقلی کا صرف اخذ اوحی اور تبلیغ شریعت کی عصمت سے ہی تعلق نہیں ہے بلکہ دیگر مراحل و درجات عصمت میں بھی یہ دلیل کار فرما ہے، جیسا کہ بعد میں آئے گا۔

عقلی گفتگو کے بعد اب ہم اس دعوے پر قرآن آیات کو دلیل بناکر پیش کرتے ہیں:

عَـٰلِمُ ٱلۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلَىٰ غَيۡبِهِۦٓ أَحَدًا

إِلَّا مَنِ ٱرۡتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُۥ يَسۡلُكُ مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهِۦ رَصَدًا

لِّيَعۡلَمَ أَن قَدۡ أَبۡلَغُواْ رِسَـٰلَـٰتِ رَبِّهِمۡ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيۡهِمۡ وَأَحۡصَىٰ كُلَّ شَيۡءٍ عَدَدَۢا

یہ آیات دلیل ہیں کہ انبیاء اخذ وحی اور اس کی حفاظت و تبلیغ میں خطا نہیں کرتے، اس لئے کہ آیت میں "یسلک" کا فاعل خدا ہے اس لئے کہ ارتضیٰ کا فاعل بھی خدا ہے، من بین یدیہ و من خلفہ یعنی آگے اور پیچھے سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے رسول کی آگے اور پیچھے سے حفاظت کرت اہے اور اپنی پیغام اور پیغامبر کو ہر قسم کے آسیب سے بچاتا ہے۔

اس جملہ کی تفسیر میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ یہ جملہ کنایہ ہے کہ فرشتے پیغمبرؐ کے اطراف قلب کا ہر آسیب سے تحفظ کرتے ہیں خواہ وہ نسیان ہو یا شیطان

۲۔ مراد یہ ہے کہ پیغمبر اخذ وحی سے لے کر اس کی تبلیغ تک دو حالت رکھتا ہے: مقام ربوبیت کی جانب متوجہ ہے لہٰذا من بین یدیہ کی تعبیر آئی اور پھر گویا مقام اخذ وحی کی جانب پشت کرکے لوگوں کی جانب تبلیغ کے لئے متوجہ ہوئے تو من خلفہ کی تعبیر آئی۔

گویا پیغمبر تمام حالات میں حفاظت خداوندی میں ہیں

اللہ کی یہ حفاظت بھی فرشتوں کے ذریعہ ہے اور یہ حفاظت اس لئے ہے:

" لِّيَعۡلَمَ أَن قَدۡ أَبۡلَغُواْ رِسَـٰلَـٰتِ رَبِّهِمۡ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيۡهِمۡ "

آیت میں علم سے مراد کسب آگاہی ہی نہیں ہے بلکہ خارج میں اس حقیقت کا اثبات اور تحقق مقصد ہے، جیسا کہ دوسری آیات میں بھی یہی مقصود ہے:

"فَلَيَعۡلَمَنَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ صَدَقُواْ وَلَيَعۡلَمَنَّ ٱلۡكَـٰذِبِينَ "[1]

تا کہ خدا کو سچے اور جھوٹے لوگوں کا علم ہو جائے

گویا خارج میں ان کی تشخیص ممکن ہو جائے

آیت سے واضح ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد اور نزول کتاب کا ہدف سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کریں اور صحیح اعتقاد و عمل کی جانب رہنمائی کریں اور یہ مقصد بغیر عصمت کے قابل حصول نہیں۔

نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ الہام و وحی کی بنا پر بولتا ہے

آیت سے واضح ہے کہ نبی اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے اس کی گفتگو واقع کے عین مطابق ہوتی ہے، خواہ اس کی گفتگو آیہ قرآنی کی شکل میں ہو یا حدیث کی شکل میں۔

گناہوں کے مقابلہ میں عصمت انبیاء

اس سلسلے میں عقلی اور قرآنی متعدد دلائل پائے جاتے ہیں لیکن ہم صرف دو عقلی دلائل یہاں پر پیش کر رہے ہیں:

۱۔ عصمت اور جذب اعتماد

بعثت انبیاء کا مقصد لوگوں کی ہدایت اور تربیت ہے اور یہ ہدف اس وقت حاصل ہو گا جب لوگوں کو مربہ کی بات سچائی کا یقین ہو گا ورنہ مربی کا پروگرام ناکام رہ جائے گا۔

۱۔ عنکبوت آیت ۳

جب مربی کے قول وفعل میں ہماہنگی ہوگی تو لوگوں کا اعتماد اس پر بڑھتا جائے گا، ورنہ اعتماد ختم ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ بعثت کا مقصد یعنی لوگوں کا نبی کا اتباع کرنا اسی وقت حاصل ہوگا جب لوگوں کا اعتماد عصمت کے سایہ میں نبی نے جذب کر لیا ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ علانیہ طور پر گناہوں سے بچنا کافی ہے نبی کے لئے لیکن خفیہ گناہوں سے بچنا لازم نہیں ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح بھی بعثت کا مقصد حاصل نہ ہوگا، اس لئے کہ لوگوں کی نظر میں نبی کے جھوٹ کا احتمال پیدا ہو جائے گا، اور سچے اور جھوٹے کی تشخیص ناممکن ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ یہ کہ صرف ایک مدت تک ہی یہ ممکن ہے کہ لوگوں کو اس طرح سے دھوکہ دیا جائے، اور نفاق اور خلوت و جلوت کے فرق سے لوگ دھوکہ کھا جائیں لیکن ایک دن یقیناً حقیقت بے نقاب ہو ہی جاتی ہے۔

۲) عوامل رجحان اور نفرت

اس دلیل کو سید مرتضیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "بعثت کا مقصد اس وقت حاصل ہوگا جب انبیاء کی زندگی میں کسی طرح کا کوئی کمزور پہلو نہ پایا جاتا ہوگا جس سے لوگوں کے دلوں میں ان کی نفرت پیدا ہو، تا کہ لوگ انبیاء کے پیغام کو اچھی طرح سنیں اور قبول کریں اور اس پر عمل کرتے ہوئے انبیاء کا اتباع کریں۔

اسی بنا پر ضرورت ہے کہ انبیاء ایسی بیماریوں سے بھی محفوظ ہوں جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں جیسے جذام اور برص وغیرہ

ایسی بیماریاں لوگوں کی دوری کا سبب اور بعثت کے مقصد کے حصول کی راہ میں مانع ہیں، اگرچہ بیماریاں انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔

اسی طرح انفرادی یا خانوادگی آلودگی بھی خواہ بعثت سے پہلے ہی کیوں نہ ہو لوگوں کی نفرت کا سبب ہے اور پھر بعثت کے ہدف کے خلاف ہے [۱]

قرآن اور عصمت انبیاء

پہلی دلیل

مندرجہ ذیل تین آیات کو آپس میں ضمیمہ کر کے دیکھا جائے تو انبیاء کی عصمت ثابت کرتی ہیں:

۱۔ تنزیہ الانبیاء ص ۴-۶

۱۔أُوْلَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُ ۖ فَبِهُدَىٰهُمُ ٱقْتَدِهْ ۗ قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَـٰلَمِينَ ﴿٩٠﴾

۲۔وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِنْ هَادٍ ﴿٣٦﴾ وَمَن يَهْدِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِن مُّضِلٍّ ۗ أَلَيْسَ ٱللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِى ٱنتِقَامٍ ﴿٣٧﴾

۳۔ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَـٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ ٱعْبُدُونِى ۚ هَـٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا۟ تَعْقِلُونَ

پہلی آیت سے ثابت ہے کہ انبیاء اللہ کی جانب سے ہدایت یافتہ ہیں لہٰذا اتباع کے قابل ہیں۔

دوسری آیت سے ثابت ہے کہ جسے اللہ ہدایت دے دے وہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا یا کوئی دوسرا اسے گمراہ نہیں کر سکتا

تیسری آیت سے واضح ہے کہ ہر شخص اللہ کی نافرمانی کی مقدار میں گمراہ اور منحرف ہے۔

تینوں آیات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر قسم کی معصیت، گمراہی ہے اور گمراہی انبیاء تک نہیں آسکتی لہٰذا گناہ و معصیت کا انبیاء کی زندگی میں گذر ناممکن ہے۔

دوسری دلیل

خداوند عالم ان لوگوں کو جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والے ہیں خوش خبری دے رہا ہے کہ ایسے لوگ جنت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے نعمتیں نازل کی ہیں، اور وہ لوگ مندرجہ ذیل ہیں:

انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین

آیت:"وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ مَعَ ٱلَّذِينَ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ وَٱلصِّدِّيقِينَ وَٱلشُّهَدَآءِ وَٱلصَّـٰلِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُو۟لَـٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾ "

لہٰذا انبیاء وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام واکرام کیا اور سورہ حمد میں فرمایا کہ جن پر اللہ نے انعام واکرام کیا ہے وہ اللہ کے غضب سے محفوظ اور گمراہی سے دور ہیں۔

صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ﴿٧﴾

ان دونوں آیات کے مجموعہ سے ثابت ہوا کہ انبیاء معصوم ہیں

تیسری دلیل:

قرآن مجید نے انبیاء کے لئے جو اوصاف بیان کئے ہیں ان میں سے ہدایت اور اجتباء بھی ہیں۔

آیت:"أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوحٖ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَٱجۡتَبَيۡنَآۚ إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُ ٱلرَّحۡمَٰنِ خَرُّواْ سُجَّدٗا وَبُكِيّٗا ﴿٥٨﴾ "[1]

آیت میں مندرجہ ذیل صفات سے انبیاء آراستہ ہیں:

۱۔ صاحب انعامات خداہیں

۲۔ اللہ کی جانب سے ہدایت یافتہ ہیں

۳۔ اللہ نے انہیں منتخب کیا ہے

۴۔ حالت سجدہ میں رہتے ہوئے خوف وعشق خدا میں گریہ کناں ہیں

انبیاء کے مقابلہ میں وہ افراد ہیں جن کا ذکر اور اوصاف اس آیت میں بیان ہوئے ہیں:

"فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ "[2]

۱۔ سورہ مریم آیت۵۸

۲۔ سورہ مریم آیت۵۹

آیت میں بیان کردہ اوصاف حسب ذیل ہیں:

۱۔ نماز کو ضائع کرنا

۲۔ شہوتوں کا اتباع کرنا

۳۔ گمراہی میں غوطے لگانا

مذکورہ بالا دنوں گروہوں کا تقابل یہ واضح کرتا ہے کہ انبیاء شہوتوں اور گناہوں سے دور ہیں، خواہشات نفسانی پر عمل نہیں کرتے، گمراہی ان سے دور ہے۔ نتیجہ یہ کہ انبیاء معصوم ہیں۔

چوتھی دلیل

دنیا کے بڑے بڑے مصلحین اپنے قول و عمل سے معاشرہ کی اصلاح کرتے ہیں اور ان کے مرید حضرات اپنی زندگی میں انہیں نمونہ اور سر مشق بناتے ہیں، ان کی نگاہوں میں اپنے رہبر کا قول و عمل دونوں یکساں طور پر قابل اطاعت ہوتا ہے، اب اگر کوئی مصلح اپنی قوم سے یہ کہے کہ "لوگو! تم میرے قول پر عمل کرو لیکن میرے عمل کا اتباع نہ کرو"

تو لوگ اس کی بات کو غیر عاقلانہ قرار دیتے ہوئے اس کا اتباع چھوڑ دیں گے۔

آیت: "وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَلَوۡ أَنَّهُمۡ إِذ ظَّلَمُوٓاْ أَنفُسَهُمۡ جَآءُوكَ فَٱسۡتَغۡفَرُواْ ٱللَّهَ وَٱسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُواْ ٱللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ "[1]

لہٰذا انبیاء قول و عمل دونوں میں قابل اتباع ہیں، اور یہی عصمت کا مفہوم ہے۔

پانچویں دلیل:

قرآن مجید کی چند آیات صراحت کے ساتھ یہ حکم دیتی ہیں کہ ہم پیغمبر اسلام کی بدون قید و شرط پیروی کریں، اور جملہ دعوتوں پر لبیک کہیں

قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾ [2]

---

۱ سورہ نساء آیت ۶۴

۲۔ سورہ آل عمران آیت ۳۱

مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدۡ أَطَاعَ ٱللَّهَ [1]

وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَخۡشَ ٱللَّهَ وَيَتَّقۡهِ فَأُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَآئِزُونَ ﴿٥٢﴾ [2]

وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ فِيكُمۡ رَسُولَ ٱللَّهِۚ لَوۡ يُطِيعُكُمۡ فِي كَثِيرٍ مِّنَ ٱلۡأَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ ......[3] ﴿٧﴾

مذکورہ بالا چاروں آیات پیغمبر کو مطاع مطلق کے عنوان سے پیش کررہی ہےیں اور پیغمبر کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے مرادف بیان کررہی ہیں، اور آیات کا یہ انداز دو اعتبار سے نبی کی عصمت کا اثبات کررہا ہے:

۱-پیغمبرؐ کی تمام زبانی دعوتیں واجب الاطاعت اور مرضی خدا کا مظہر ہیں، اسلئے اگر وہ قول کے اعتبار سے معصوم نہ ہوں تو تمام دعوتیں واجب الاطاعت نہ ہوں گی، آیات کا یہ انداز پیغمبر کی قولی عصمت کا ثبوت ہے۔

۲۔ تبلیغ فعلی و عملی: لوگوں کی نظر میں قولی تبلیغ سے بھی زیادہ موثر ہے، لہٰذا انبیاء کا ہر عمل در حقیقت اتباع کی دعوت ہے، اور انبیاء کی زندگی کو تمام لوگ بہت ہی دقت سے معاشرہ میں دیکھتے ہیں اور ان کے ہر قول و عمل کو اپنے لئے سند بناتے ہیں اسی بنا پر قرآن نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسوہ حسنہ کہا ہے۔

"لَّقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرۡجُواْ ٱللَّهَ وَٱلۡيَوۡمَ ٱلۡأٓخِرَ وَذَكَرَ ٱللَّهَ كَثِيرًا "[4]

آیت کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ عمل ہونا ثبوت ہے کہ انبیاء معصون ہیں اور ان کا قول و عمل پوری طرح اللہ کی رضا کا نمونہ ہے۔

چھٹی دلیل:

قرآن مجید کے مطابق شیطان نے اللہ کی بارگاہ سے نکالے جانے کے موقع پر کہا:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغۡوِيَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ ٱلۡمُخۡلَصِينَ ﴿٨٣﴾ (سورہ ص آیت ۸۲-۸۳)

یہی مضمون سورہ حجر میں بھی پایا جاتا ہے:

۱۔ سورہ نساء آیت ۸۰

۲۔ سورہ نور آیت ۵۲

۳۔ سورہ حجرات آیت ۷

۴۔ سورہ احزاب آیت ۲۱

وَلَأُغۡوِيَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ ٱلۡمُخۡلَصِينَ ﴿٤٠﴾ (سورہ حجر آیت۳۹/۴۰)

اسی قسم کی آیات اللہ کے مخلص بندوں کے شیطان کے شر اور حملہ سے حفاظت کی نشاندہی کر رہی ہیں۔اور شیطان کے شر سے حفاظت سوائے عصمت مطلق کے کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی،اسلئے کہ ہر گناہ اپنی مناسبت سے شیطان کا حملہ ہے،خواہ کتنا ہی مختصر نہ و،اور وہ انسان کو عصمت سے اتنا ہی دور کرتا اہے،لہٰذا اس کے شر سے حفاظت یعنی درجہ عصمت پر فائز ہونا۔پھر قرآن کی چند آیات مصداقی طور پر اہل اخلاص کی نشاندہی کر رہی ہیں:

آیت:

وَٱذۡكُرۡ عِبَٰدَنَآ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ أُوْلِي ٱلۡأَيۡدِي وَٱلۡأَبۡصَٰرِ ﴿٤٥﴾ إِنَّآ أَخۡلَصۡنَٰهُم بِخَالِصَةٖ ذِكۡرَى ٱلدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَإِنَّهُمۡ عِندَنَا لَمِنَ ٱلۡمُصۡطَفَيۡنَ ٱلۡأَخۡيَارِ ﴿٤٧﴾ وَٱذۡكُرۡ إِسۡمَٰعِيلَ وَٱلۡيَسَعَ وَذَا ٱلۡكِفۡلِۖ وَكُلّٞ مِّنَ ٱلۡأَخۡيَارِ ﴿٤٨﴾ (سورہ ص آیت۴۵-۴۸)

مذکورہ بالا آیت نے چند پیغمبرؑوں کو مخلصین کے زمرے میں شمار کیاہے اور اس آیت سے پہلے ہم نے شیطان کی حکایت کے طور پر جن آیات کو نقل کیاان سب کو ضمیمہ کرکے یہ نتیجہ حاصل ہوتاہے کہ مذکورہ بالا پیغمبران بہ نص آیت قرآنی معصوم اور عصمت کے زیور سے آراستہ ہیں۔

اور یہ مسلم ہے کہ کوئی بھی انبیاء کے بارے میں تفصیل کا قائل نہیں ہوا ہے کہ مثلاً مذکورہ بالا پیغمبران کو معصوم جانے اور جن کا ذکر آیت میں نہیں آیاہے انہیں معصوم قرار نہ دیاجائے۔

لہٰذا یہ نتیجہ حاصل ہوتاہے کہ مذکورہ بالا پیغمبروں کی عصمت کا قرآن مجید سے ثابت ہونا یہ واضح کرتاہے کہ تمام پیغمبر اور تمام انبیاء معصوم ہیں،چنانچہ دیگر آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

آیت:وَٱجۡتَبَيۡنَٰهُمۡ وَهَدَيۡنَٰهُمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ﴿٨٧﴾ (سورہ انعام آیت۸۷)

مذکورہ بالا آیت میں اللہ نے چند انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد ان کی توصیف اس طرح بیان کی کہ ہم نے انہیں مجتبیٰ اور منتخب کیا،اجتباء کی تعبیر کا مفہوم در حقیقت اعطاء عصمت ہے،اور بس جب چند انبیاء کی عصمت قران سے ثابت ہے تو یہ در حقیقت تمام انبیاء کی عصمت کا ثبوت ہے،اس لئے کہ اس بارے میں کوئی بھی متکلم،تفصیل کا قائل نہیں ہے۔

عصمت کے منکرین کی دلیلیں

مسئلہ عصمت علم کلام کا اہم ترین مسئلہ ہے جس پر متعدد عقائد کی بناید قائم ہے، اگر اس مسئلہ کا اثبات نہ ہو تو بہت سے مسائل کا ثابت ہونا ناممکن ہو جائے گا، اسی لئے قرآن نے بھی تصریحاً اور کہیں تلویحاً اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے جیسا کہ ہم نے گذشتہ اوراق پر ثابت کیا، لیکن پھر بھی مخالفین عصمت پیدا ہو گئے جنہوں نے قرآن کی ان آیات کو سند بنا کر عصمت انبیاء کا انکار کیا جن آیات کا ظاہر قابل تصرف تھا۔

ان کی یہ کوشش اس لئے ہے کہ الٰہی مناصب بھی عام ہو جائیں اور دنیاوی منصب اور عہدہ کی ردیف میں شمار ہونے لگیں۔

اس طرح کی آیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱-چند آیات وہ ہیں جو بظاہر تمام انبیاء کی عصمت کے خلاف ہیں۔

۲۔چند آیات وہ ہیں جو کچھ مخصوص انبیاء کی عصمت کے خلاف ہیں جیسے حضرت آدم و یونس و داؤد وغیرہ

۳۔چند آیات وہ ہیں جن کا تعلق صرف ہمارے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے

اب ہم الگ الگ ہر قسم کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں:

پہلی قسم:

آیات سورہ یوسف

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُّوحِىٓ إِلَيۡهِم مِّنۡ أَهۡلِ ٱلۡقُرَىٰٓۗ أَفَلَمۡ يَسِيرُواْ فِى ٱلۡأَرۡضِ فَيَنظُرُواْ كَيۡفَ كَانَ عَـٰقِبَةُ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِمۡۗ وَلَدَارُ ٱلۡأَخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِينَ ٱتَّقَوۡاْۗ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ﴿١٠٩﴾ (سورہ یوسف آیت ۱۰۹)

حَتَّىٰٓ إِذَا ٱسۡتَيۡـَٔسَ ٱلرُّسُلُ وَظَنُّوٓاْ أَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُواْ جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا فَنُجِّىَ مَن نَّشَآءُۖ وَلَا يُرَدُّ بَأۡسُنَا عَنِ ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡمُجۡرِمِينَ ﴿١١٠﴾ (سورہ یوسف آیت ۱۱۰)

آیت میں "حتیٰ" انتہائے غایت کے لئے آیا ہے، گویا ایک جملہ یہاں پر مقدر ہے جس کی انتہا کو یہ بتا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انبیاء نے بہت کوشش کی کہ قوم راہ راست پر آجائے مگر وہ پھر بھی نہیں آئے یہاں تک کہ انبیاء کی ناامیدی کا وقت آگیا۔

عربی میں یاس اور استیئاس میں فرق ہے کہ یاس یعنی کاملاً مایوس ہو جانا اور باب استفعال کے خواص کی بنا پر استیئاس یعنی مایوسی کی علامتوں کا ظاہر ہو جانا، خود مایوسی سے پہلے۔

آیت میں مخالفین عصمت نے اس جملہ کو سند بنایا ہے:"وَظَنُّوٓاْ أَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُواْ " یعنی انہوں نے گمان کیا کہ گویا اللہ نے ان سے نصرت کا جھوٹا وعدہ کیا ہے، گویا انبیاء اللہ کی طرف ایسی نسبت کذب دے سکتے ہیں جو دلیل ہے عدم عصمت انبیاء کی۔

جواب: مذکورہ بالا آیت کی متعدد تفاسیر کا امکان اور احتمال اس کی مذکورہ دلالت کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے اور وہ تفاسیر حسب ذیل ہیں:

تفسیر اول: یہ ہے کہ انبیاء نے گمان کیا کہ جن لوگوں نے بظاہر ان پر یمان کا اعلان کیا ہے انہوں نے بھی جھوٹ بولا ہے، حقیقت میں وہ بھی ایمان سے عاری ہیں، جس طرح باقی افراد قوم بر ملا تکذیب پر کمر بستہ ہیں۔

یہ تفسیر بظاہر ایک اچھی تفسیر ہے کہ اس میں ضمائر اور ان کے مرجع کی ترتیب بر قرار ہے مگر اشکال یہ ہے کہ آیت کے سیاق وسباق میں ایسے قرائن کا وجود نہیں جو تفسیر کی تائید کرتے ہوں۔

اس کے علاوہ یہ کہ اگر افراد قوم نے جھوٹ بھی آکر ایمان کا اظہار کیا تو انکے بارے میں بھی انبیاء کی ایسی بدگمانی عصمت کے منافی ہے۔

تفسیر دوم: یہ ہے کہ ظنوا کی ضمیر کا تعلق تمام لوگوں سے ہے یا صرف اہل ایمان سے ہے۔

گویا آیت کا مطلب یہ ہو کہ انبیاء کو دشواریوں میں غرق دیکھ کر تمام افراد قوم یا قوم کے اہل ایمان افراد نے یہ گمان کیا کہ مدد کا جو وعدہ انبیاء سے کیا گیا ہے وہ جھوٹا ہے۔

اس تفسیر میں بھی پلا اشکال تو نہیں ہے مگر آیت کے ظہور اور ظاہر الفاظ کے خلاف ہے، اس لئے کہ آیت میں بظاہر چاروں ضمائر کا مارجع ایک ہے، جبکہ اس تفسیر کے مطابق ظنوا کی ضمیر کا مرجع افراد قوم اور باقی تین ضمائر کا مرجع انبیاء ہیں، لہذا قطعی دلیل کے نہ ہوتے ہوئے آیت کے ظہاری الفاظ میں تصرف صحیح نہیں ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ آیت میں تمام ضمیروں کا مرجع انبیاء ہیں۔

تفسیر سوم: یہ ہے کہ تمام ضمیروں کا مرجع انبیاء ہی ہیں اور یہ گمان بھی انبیاء نے ہی کیا کہ نصرت کا جو وعدہ ان سے کیا گیا ہے وہ جھوٹ اہے، لیکن اس بدگمانی کا پیدا ہونا نہ صرف یہ کہ عصمت کے منافی نہیں ہے، بلکہ فطرت بشری کے عین مطابق ہے کہ جب انسان چاروں طرف سے مصائب وآلام میں گرفتار ہو جاتا ہے اور کوئی بھی اس کے استغاثہ پر لبیک نہیں کہتا تو خواہ ایمان کی کسی بھی منزل پر کیوں نہ ہو وہ بھی یہی سوچتا

ہے کہ جو وعدہ نصرت ہم سے کیا گیا ہے وہ جھوٹا ہے، لیکن یہ خیال صرف ایک لحظہ کے لئے آتا ہے اور صحیح افکار اس کی جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں۔

یہ تفسیر بھی اختلاف مرجع ضمائر کے اشکال سے محفوظ ہے، لیکن انبیاء کی صحیح درجہ کی معرفت اور ان کے عرفان کامل کے خلاف ہے، اسلئے کہ وہ حضرات مذکورہ حالات میں بھی اللہ کے بارے میں حتیٰ ایک لمحہ کے لئے بھی ایسی بدگمانہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے، ان کی تائید ہمیشہ روح القدس کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔

تفسیر چہارم: چوتھی تفسیر میں چاروں ضمیروں کے مرجع کی وحدت بھی برقرار ہے، اور عصمت انبیاء پر بھی کوئی اشکال وارد نہیں ہے، یہ تفسیر اس وقت واضح ہو گی جب اس آیت کی نظر دیگر آیات میں دستیاب ہو جائے، اور پھر آیت کی تفسیر خود آیت سے کی جائے، چنانچہ ہم یہاں پر اس طرح گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں:

جناب یونس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح ہے:

"وَذَا ٱلنُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَٰضِبٗا فَظَنَّ أَن لَّن نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادَىٰ فِي ٱلظُّلُمَٰتِ أَن لَّآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنتَ سُبۡحَٰنَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٨٧﴾ "[1]

آیت میں ذکر شدہ گمان حضرت یونس کے قلب سے گذرا بھی نہ تھا، لیکن اس گمان کی علامت ان کا وہ عمل تھا کہ انہوں نے قوم کو ترک کیا، ان کے اسی عمل کو قرآن نے گویا گمان کے لفظ میں بیان کیا۔ چنانچہ جب وہ شکم ماہی میں پھنس گئے تو ذکر خدا میں مشغول ہو گئے اور کہا: "لَّآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنتَ سُبۡحَٰنَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٨٧﴾ "

اس طرح قرآن نے بنی نظیر کو یہودیوں کے بارے میں فرمایا جب انہوں نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور اپنی دکانیں بند کر دیں اور قلعوں میں پناہ گزیں ہو گئے:

"..........وَظَنُّوٓاْ أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمۡ حُصُونُهُم مِّنَ ٱللَّهِ .... ﴿٢﴾ "[2]

ان کے اس گمان کا سرچشمہ خود ان کا عمل تھا کہ وہ قلعوں میں پناہ گزیں ہو گئے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہ قلعے انہیں بچالیں گے، اور وہ مسلمانوں کے حملہ سے محفوظ ہو جائیں گے لہذا اس آیت میں بھی گمان سے مراد خود ان کا عمل ہے ورنہ ہو سکتا ہے یہ گمان ان

۱۔ سورہ انبیاء ۸۷

۲۔ سورہ حشر آیت ۲

کے دل میں آیا بھی نہ ہو۔ خود ہمارے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے اگر کوئی حریص انسان مال ودولت اور عمارت بنانے کے لئے بہت محنت کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ "اس کا گمان یہ ہے کہ ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے" گویا اس کا عمل ایسا ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہ گمان اس کے دل میں آیا بھی نہ ہو۔

ان مثالوں کے بعد اب آیت کی تفسیر آسان ہو گئی:

وظنوا انھم قد کذبوا

یعنی یہ گمان کہ نصرت خدا کا وعدہ جھوٹا ہے، انبیاء سے متعلق نہیں ہے وہ ہر گز ایسی بد گمانی کے شکار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ انبیاء کے ظاہری حالات دشواریوں کی بنا پر ایسے ہو گئے تھے کہ گویا ایسا لگتا تھا کہ وعدہ نصرت جھوٹا ہے، یعنی ایسا لگتا تھا کہ گویا خود انبیاء نے ہی یہ گمان کیا ہے، اسلئے کہ مصائب وآلام میں چاروں سمت سے گرفتار تھے، اور بس یہی سوچا کرتے تھے کہ "متیٰ نصر اللہ" نصرت خدا کب آئے گی، ورنہ تو وعدہ نصرت کے جھوٹ کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔

گویا یہ گمان، ان کی فکر وزبان سے دور تھا مگر ان کی زبان حال پر تھا۔

اور قرآن نے ان حالات کی ترجمانی اس انداز سے کی ہے:

"أَمۡ حَسِبۡتُمۡ أَن تَدۡخُلُواْ ٱلۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَأۡتِكُم مَّثَلُ ٱلَّذِينَ خَلَوۡاْ مِن قَبۡلِكُمۖ مَّسَّتۡهُمُ ٱلۡبَأۡسَآءُ وَٱلضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُواْ حَتَّىٰ يَقُولَ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ مَتَىٰ نَصۡرُ ٱللَّهِۗ أَلَآ إِنَّ نَصۡرَ ٱللَّهِ قَرِيبٌ "[1]

اس بنا پر یہ ثابت ہوا کہ مذکورہ آیت عصمت کے منافی نہیں ہے۔ اور انبیاء ہر گز ایسی بد گمانی کے شکار نہیں ہو سکتے۔ ایک عام فرد جس کا ایمان پختہ ہو وہ بھی اس گمان سے دور ہے چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام۔

مخالفین کی دوسری دلیل (پہلی قسم)

آیات سورہ حج:

۱۔ بقرہ ۲۱۴

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلْقَى ٱلشَّيْطَٰنُ فِىٓ أُمْنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ ٱللَّهُ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٢﴾ (سورہ حج آیت ۵۲)

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَٱلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ لَفِى شِقَاقٍۭ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾ (سورہ حج آیت ۵۳)

وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا۟ بِهِۦ فَتُخْبِتَ لَهُۥ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ ٱللَّهَ لَهَادِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٤﴾ (سورہ حج آیت ۵۴)

مخالفین عصمت نے پہلی دو آیات کے مضمون کا سہارا لیتے ہوئے یہ بیان دیا ہے کہ جب بھی انبیاء کسی چیز کی آرزو کرتے تھے شیطان ان کی تمناؤں میں دخل و تصرف کرتا تھا، پھر اللہ انبیاء کے قلوب سے شیطان کے دخل واثر کو محو کر دیتا تھا۔

آیت سے ثابت ہوا کہ انبیاء ہوا کی زندگی میں بھی ہماری طرح شیطان کی دخالت پائی جاتی ہے، خواہ بعد میں اللہ اسکا ازالہ کر دے، اور ی عصمت کے منافی ہے۔

جواب مذکورہ تفسیر آیت کے صحیح مفاد سے ناآگاہی کا نتیجہ ہے، ہمیں مذکورہ آیت میں پہلے حسب ذیل سوالات کو حل کرنا ہو گا پھر آیت کا صحیح مفہوم واضح ہو گا:

انبیاء کی آرزو سے مراد کیا ہے؟

ب:ان تمناؤں میں شیطان کا دخل کس طرح ہوا؟

ج:اللہ کے محو کرنے سے مراد کیا ہے؟

الف:انبیاء کی تمنائیں:

عربی میں تمنا یعنی کسی چیز کے وجود کو فرض کرنا، انبیاء کی تمنا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اللہ کا دین پھیلے اور لوگ ہدایت یافتہ ہو جائیں۔

اس تمنا کے لئے انبیاء نے مصائب برداشت کئے:

"وَمَآ أَكۡثَرُ ٱلنَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ "[۱]

حضرت نوح کی دعوت کا حال یہ ہے:

وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوٓاْ أَصَٰبِعَهُمۡ فِيٓ ءَاذَانِهِمۡ وَٱسۡتَغۡشَوۡاْ ثِيَابَهُمۡ وَأَصَرُّواْ وَٱسۡتَكۡبَرُواْ ٱسۡتِكۡبَارٗا ﴿٧﴾ ثُمَّ إِنِّي دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارٗا ﴿٨﴾ ثُمَّ إِنِّيٓ أَعۡلَنتُ لَهُمۡ وَأَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ إِسۡرَارٗا ﴿٩﴾ [۲]

انبیاء کی یہی تمنا تھی جس کا نتیجہ دعوت تھی

ب: انبیاء کی تمناؤں میں شیطان کا دخل

انبیاء کی تمناؤں میں شیطان کا دخل دو طرح سے قابل تصور اور ممکن ہے:

۱۔ انبیاء کے عزم و ارادہ میں خلل پیدا کر دے اور ایک گروہ کی ہدایت کی طرف سے انبیاء کو وسوسہ پیدا کر کے ناامید کر دے، یہ احتمال بہت سی آیات کے خلاف ہے بطور مثال:

"إِنَّ عِبَادِي لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَٰنٌ ...."[۳]

بیشک میرے واقعی بندوں پر تو قبضہ نہیں کر سکتا

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغۡوِيَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ ٱلۡمُخۡلَصِينَ ﴿٨٣﴾ [۴] (سورہ ص آیت ۸۲-۸۳)

۱۔ سورہ یوسف آیت ۱۰۳

۲۔ سورہ نوح آیت ۷-۹

۳۔ سورہ حجر آیت ۴۲ و سورہ اسرا آیت ۶۵

۴۔ سورہ ص آیت ۸۲-۸۳

۲۔ شیطان لوگون کو انبیاء کے خلاف تحریک کرے اور لوگوں کو انبیاء کے مقابلے میں کھڑا کردے جس سے انبیاء کی تمنائیں پوری نہ ہوسکیں۔

ہماری نظر میں شیطان کے انبیاء کی آرزوؤں میں دخل دینے سے یہی معنی مراد ہیں جو دیگر آیات قرآن کے مطابق ہے:

"يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾ "[1]

"وَقَالَ ٱلشَّيْطَٰنُ لَمَّا قُضِىَ ٱلْأَمْرُ إِنَّ ٱللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ ٱلْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِىَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَٰنٍ إِلَّآ أَن دَعَوْتُكُمْ فَٱسْتَجَبْتُمْ لِى ۖ فَلَا تَلُومُونِى وَلُومُوٓا۟ أَنفُسَكُم ۖ ...... ﴿٢٢﴾ "[2]

ج: شیطان کی دخالت کو اللہ کا بے اثر کرنا

اس سے مراد اللہ کی نصرت ہے جو ہمیشہ انبیاء کے شامل حال رہی ہے:

"إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ ٱلْأَشْهَٰدُ ﴿٥١﴾"[3]

کبھی اللہ نے یہ نصرت گمراہوں کو غرق یا نیست و نابود کر کے انجام دی ہے جیسا کہ حضرت نوح و لوط کے قصہ میں ہے، چنانچہ شیطان کا وسوسہ کرنا اور پھر اللہ کا اس کو محو کرنا در حقیقت بندوں کا امتحان ہے، اور اس منزل پر لوگوں کے دو گروہ ہیں:

۱- بیمار اور سنگدل افراد جو شیطان کی پیروی کرتے ہیں:

"لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ ..... "[4]

۱۔ نساء ۱۲۰

۲۔ سورہ ابراہیم آیت ۲۲

۳۔ سورہ غافر آیت ۵۱

۴۔ سورہ حج آیت ۵۳

۲۔ عقلمند اور حق سے آشنا افراد

یہ لوگ نبی کی دعوت کو اللہ کی جانب سے جانتے ہوئے قبول کرتے ہیں:

" وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلْعِلْمَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ ...."[1]

"فيؤمنوا به فتخبت له قلوبهـم "

چند سوال:

۱-پہلی آیت میں "اٰیاتہٖ" سے مراد کیا ہے؟

جواب: چونکہ موضوع بحث تمام انبیاء ہیں جیسا کہ آیت میں آیا ہے "من رسولٍ ولا نبیٍ" اس بنا پر آیات سے مراد آیات قرآنی نہیں ہیں بلکہ مراد ہدایت اور حقانیت وسعادت بشری کی نشانیاں اور دلائل ہیں جو درواقع اللہ کی نشانیاں ہیں۔

۲۔اس جملہ میں ضمیر کا مرجع کیا ہے "فیؤمنوا بہ"؟

جواب: لفظ بہ کی ضمیر کا مرجع ہے متمنا یعنی جس کی آرزو کی جائے اس دعوے کی دلیل جملہ اذا تمنیٰ ہے جو آیت میں آیا ہے اور اس ضمیر کا مرجع ہرگز قرآن نہیں ہے۔

۳۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں سورہ نجم کی تلاوت کر رہے تھے جب اس آیت پر پہنچے "افرائیتم اللات والعزیٰ؛ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ" تو شیطان نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر یہ جملہ جاری کر دیا:

" تلک غرانیق العلیٰ وان شفاعتھن ترتجیٰ"

یہ سنتے ہیں مشرکین خوش ہوگئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتوں کی تعریف کی ہے، پھر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سورے کو پورا کرکے سجدہ کیا (جو واجب سجدہ ہے) اور پھر تمام مسلمانوں اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا، پھر جبرئیل نازل ہوئے اور کہا کہ یہ جملہ وحی خدا نہیں تھا بلکہ شیطان کا اشارہ تھا، پھر یہ تینوں آیتیں نازل ہوئیں، کیا یہ شان نزول صحیح ہے؟

جواب: یہ شان نزول باطل ہے اور اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب فروغ ابدیت میں بیان کی ہے۔

۱۔ سورہ حج آیت ۵۴

یہاں بھی خلاصہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ اگر یہ شان نزول صحیح ہوتی تو آیت میں لفظ تمنی کے بجائے لفظ تلیٰ آیا ہوتا، اور لفظ تمنا صرف آرزو کے معنی میں ہے نہ کہ تلاوت کے معنی میں

اور اگر اشعار میں تلاوت کے معنی میں آیا ہے تو یہ شاذ استعمال ہے۔

۲۔ اگر شان نزول کی عبارت میں غور کیا جائے تو کذب محض ہونا واضح ہے، اس لئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ جملہ کہا اور اس کے بعد پھر اس سورے کی آخر تک تلاوت کی تو کیسے مشرکین نے جو عربی زبان سے آشنا تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا جبکہ بعد کی آیات میں بتوں کی مذمت واضح طور پر کی گئی ہے:

"إِنۡ هِيَ إِلَّآ أَسۡمَآءٞ سَمَّيۡتُمُوهَآ أَنتُمۡ وَءَابَآؤُكُم......."[1]

"وَأَنَّهُۥٓ أَهۡلَكَ عَادًا ٱلۡأُولَىٰ ﴿٥٠﴾ وَثَمُودَاْ فَمَآ أَبۡقَىٰ ﴿٥١﴾ وَقَوۡمَ نُوحٖ مِّن قَبۡلُۖ إِنَّهُمۡ كَانُواْ هُمۡ أَظۡلَمَ وَأَطۡغَىٰ ﴿٥٢﴾ "[2]

۳۔ ظاہر شان نزول کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے ان جملوں کو کوئی نہیں جانتا تھا، جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مشرکین دور جاہلیت میں طواف اور سعی کے دوران یہ جملے زبان پر جاری کرتے تھے اور حج کی ادائیگی کرتے تھے۔

۴۔ جب انبیاء کی عصمت قرآن کی صریحی آیات اور دیگر قطعی دلائل سے ثابت ہوگئی تو اس قسم کی شان نزول کا بطلان خود بخود واضح ہوگیا۔

گویا یہ شان نزول دشمنان اسلام کی ایجاد ہے، اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو اسلام و قرآن کا تقدس پائمال ہو کر رہ جائے گا۔

ہم نے یہاں پر اس شان نزول کے اشکالات کا صرف خلاصہ پیش کیا ہے ورنہ اشکالات اس سے بھی زیادہ ہیں۔

۱۔ سورہ نجم آیت ۲۳

۲۔ سورہ نجم آیت ۵۰ -۵۲

مخالفین عصمت کی دوسری دلیل

دوسری دلیل سے مراد وہ آیتیں ہیں جو بظاہر کچھ مخصوص انبیاء کی عصمت کے خلاف ہیں، اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں:

عصمت حضرت آدم اور شجرہ ممنوعہ کا واقعہ

آیات:

۱. وَقُلْنَا يَـٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٣٥﴾

۲. فَأَزَلَّهُمَا ٱلشَّيْطَـٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا ٱهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَـٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾

۳. فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَـٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾

۴. فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَـٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ ....﴿٣٧﴾

۵. وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾

۶. يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ....﴿١﴾

۷. وَٱجْتَبَيْنَـٰهُمْ وَهَدَيْنَـٰهُمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٨٧﴾ (سورہ انعام آیت ۸۷)

۸. وَيَـٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿١٩﴾

۹. فَوَسْوَسَ لَهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُۥرِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْءَٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَىٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةِ إِلَّآ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ ٱلْخَٰلِدِينَ ﴿٢٠﴾

۱۰. وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ ﴿٢١﴾

۱۱. فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا ٱلشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ ٱلْجَنَّةِ ۖ وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٢﴾

۱۲. قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾

۱۳. وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ ﴿٢١﴾

۱۴. أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٢﴾

۱۵. فَوَسْوَسَ لَهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ.........

۱۶. ....رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا.........

۱۷. وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾

۱۸. هُوَ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّىٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِۦ ۖ فَلَمَّآ أَثْقَلَت دَّعَوَا ٱللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ ءَاتَيْتَنَا صَٰلِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ ٱلشَّٰكِرِينَ ﴿١٨٩﴾

۱۹. فَلَمَّآ ءَاتَىٰهُمَا صَٰلِحًا جَعَلَا لَهُۥ شُرَكَآءَ فِيمَآ ءَاتَىٰهُمَا ۚ فَتَعَٰلَى ٱللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ

۲۰. أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾

۲۱. وَلَا يَسۡتَطِيعُونَ لَهُمۡ نَصۡرًا وَلَآ أَنفُسَهُمۡ يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾

۲۲. يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا .... ﴿٢٦﴾

۲۳. يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ لَا يَفۡتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيۡطَٰنُ كَمَآ أَخۡرَجَ .... ﴿٢٧﴾

۲۴. يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ ....

۲۵. يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ إِمَّا يَأۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٞ مِّنكُمۡ .... ﴿٣٥﴾

۲۶. وَإِذۡ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِيٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمۡ .... ﴿١٧٢﴾ (سورہ اعراف آیت ۱۷۲)

۲۷. هُوَ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٖ وَٰحِدَةٖ وَجَعَلَ مِنۡهَا .... ﴿١٨٩﴾

۲۸. لَّقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلۡعُسۡرَةِ .... ﴿١١٧﴾ (سورہ توبہ آیت ۱۱۷)

۲۹. وَقَالَ ٱلشَّيۡطَٰنُ لَمَّا قُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ إِنَّ ٱللَّهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ ٱلۡحَقِّ وَوَعَدتُّكُمۡ فَأَخۡلَفۡتُكُمۡۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيۡكُم مِّن سُلۡطَٰنٍ إِلَّآ أَن دَعَوۡتُكُمۡ فَٱسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوٓاْ أَنفُسَكُمۖ مَّآ أَنَا۠ بِمُصۡرِخِكُمۡ وَمَآ أَنتُم بِمُصۡرِخِيَّ .... ﴿٢٢﴾

۳۰. إِنَّ عِبَادِي لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَٰنٌ إِلَّا مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلۡغَاوِينَ ﴿٤٢﴾

۳۱. إِنَّ عِبَادِي لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَٰنٌ إِلَّا مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلۡغَاوِينَ ﴿٤٢﴾

۳۲. إِنَّ عِبَادِي لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَٰنٌ إِلَّا مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلۡغَاوِينَ ﴿٤٢﴾

۳۳. إِنَّهُۥ لَيۡسَ لَهُۥ سُلۡطَٰنٌ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَلَىٰ رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾

۳۴. إِنَّمَا سُلۡطَٰنُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يَتَوَلَّوۡنَهُۥ وَٱلَّذِينَ هُم بِهِۦ مُشۡرِكُونَ ﴿١٠٠﴾

۳۵. إِنَّ عِبَادِى لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ﴿٦٥﴾

۳۶. وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِىَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

۳۷. وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ ﴿١١٦﴾

۳۸. فَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰٓ

۳۹. إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾

۴۰. وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا۟ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾

۴۱. فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ ٱلشَّيْطَٰنُ قَالَ يَٰٓـَٔادَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ ٱلْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ﴿١٢٠﴾

۴۲. فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ ٱلْجَنَّةِ ۚ وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾

۴۳. ثُمَّ ٱجْتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

۴۴. فَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰٓ ﴿١١٧﴾ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا۟ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾ (سورہ طہ آیت۱۱۷-۱۱۹)

۴۵. إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾

۴۶. فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ ٱلشَّيْطَٰنُ.............

۴۷. ....وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾ ثُمَّ ٱجْتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

۴۸. ثُمَّ ٱجْتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

۴۹. ثُمَّ ٱجْتَبَـٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

۵۰. ....فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

(سورہ ص آیت ۸۲-۸۳)

۵۱. خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ ٱلْأَنْعَـٰمِ ثَمَـٰنِيَةَ أَزْوَٰجٍ ۚ يَخْلُقُكُمْ فِى بُطُونِ أُمَّهَـٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِى ظُلُمَـٰتٍ ثَلَـٰثٍ ۚ ....﴿٦﴾

۵۲. وَمَن يَهْدِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِن مُّضِلٍّ ۗ ....﴿٣٧﴾ (سورہ زمر آیت ۳۷)

۵۳. يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ ....﴿١٣﴾

۵۴. ....تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ﴿٨﴾

تفسیر آیات

بیان دلیل: مخالفین عصمت کی قوی ترین دلیل حضرت آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام کا قصہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی صریحی حکم کی نافرمانی کی اور اور جنت سے خارجہ کی شکل میں انہیں سزا بھی برداشت کرنا پڑی اور وہ حکم یہ تھا:

"وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ "

اور یہ نافرمانی اور اسکی سزا دلیل ہے کہ انبیاء معصوم نہیں ہوتے۔

جواب: قرآن مجید نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ مختلف سوروں میں بیان کیا ہے اور بقرہ، اعراف اور طٰہٰ میں تفصیل سے بیان کیا ہے، ہم یہاں پر متعلقہ آیات کو نقل کر کے تفسیر موضوعی کی شکل میں واقعہ کی صحیح حقیقت تک پہونچنا چاہتے ہیں:

اس واقعہ سے متعلق سورہ بقرہ کی آیات حسب ذیل ہیں:

وَقُلْنَا يَـٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٣٥﴾

فَأَزَلَّهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا ٱهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾

فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾

سورہ اعراف کی آیات حسب ذیل ہیں:

وَيَٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٩﴾

فَوَسْوَسَ لَهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ لِيُبْدِىَ لَهُمَا مَا وُۥرِىَ عَنْهُمَا مِن سَوْءَٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَىٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةِ إِلَّآ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ ٱلْخَٰلِدِينَ ﴿٢٠﴾

وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّى لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ ﴿٢١﴾

فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا ٱلشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ ٱلْجَنَّةِ ۖ وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٢﴾

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾

سورہ اعراف کی آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ سورہ بقرہ کے مقابلہ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، اور اس کا سبب بھی واضح ہے کہ سورہ اعراف مکہ میں نازل ہوا، اور اسمیں تفصیل بیان ہونے کے بعد ضرورت نہیں رہ گئی کہ سورہ بقرہ جو بعد میں مدینہ میں نازل ہوا اس میں بھی تفصیل سے اس قصہ کو بیان کیا جائے۔

اسی طرح سورہ طٰہٰ میں بھی اس قصہ کو بہت سے جزئیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔

سورہ طٰہٰ کی آیات حسب ذیل ہیں:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِىَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ ﴿١١٦﴾

فَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰٓ ﴿١١٧﴾

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾

وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا۟ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ ٱلشَّيْطَٰنُ قَالَ يَٰٓـَٔادَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ ٱلْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ﴿١٢٠﴾

فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ ٱلْجَنَّةِ ۚ وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾

ثُمَّ ٱجْتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

مذکورہ تمام آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے عصمت انبیاء کا عقیدہ رکھنے والوں کو حسب ذیل سوالات کا جواب دیناہوں گے:

۱- آیہ ولا تقربا ھذہ الشجرۃ میں نہی مولوی ہے یا ارشادی؟

۲۔ آیات کے ان الفاظ سے مراد کیا ہے: فازلھما الشیطان (سورہ بقرہ) اور تقریباً اسی کا ہم معنی سورہ اعراف میں فدلّٰھما بغرور؟

۳۔ قرآن کی تصریح کے مطابق جب شیطان مخلصین تک نہیں پہنچ سلتا تو پھر کیسے حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچ گیا: فوسوس لھما الشیطان؟

۴۔ ظلم سے مراد ان آیات میں کیا ہے: فتکونا من الظالمین (بقرہ) ربنا ظلمنا انفسنا (اعراف)

۵۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ نہیں کیا تو یہ الفاظ کس معنی میں ہیں: وعصی ادم ربہ فغویٰ (طٰہٰ)؟

۶۔ اگر گناہ نہیں کیا تھا تو پھر تونہ کا مفہوم کیا ہے: فتاب علیہ (بقرہ)؟

۷- اگر گناہ نہیں کیا تھا تو مغفرت سے مراد کیا ہے: وان لم تغفر لنا و ترحمنا (اعراف)؟

جوابات

ا۔ اوامر ونواہی کی دو قسمیں ہیں:

الف: امر و نہی مولوی: یعنی مولا حق ولایت رکھنے کی بنا پر کسی کو امر و نہی کرت اہے جیسے اللہ اور اس کا رسولؐ بندوں کو حکم دیں یا روکیں

ب: امر و نہی ارشادی: جہاں مولا حق ولایت کی بنا پر امر و نہی کرتا ہے بلکہ خیر خواہی اور صلاح وفلاح کے لئے امر و نہی نافذ کرتا ہے، جس کا سرچشمہ نصیحت اور دلسوزی ہوتا ہے، جیسے طبیب بیمار سے بعض غذاؤں سے اجتناب کا حکم دیتا ہے

نہی خدا درخت کے بارے میں حضرت آدم کے لئے ارشادی تھی؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نہی اللہ نے حق ولایت کی بنا پر صادر فرمائی تھی جس نتیجہ دنیاوی پریشانیوں (جنت سے خارجہ، لباس جنت کا واپس لیا جانا اور دنیا میں آنا اور زحمتوں میں مبتلا ہونا) کے علاوہ عذاب آخرت بھی ہوتا ہے، یا یہ نہی ارشادی تھی جس نتیجہ فقط دنیاوی آلام تھے جیسے کوئی اپنے دوست کو چرس یا گانجا پینے سے روکتا ہے؟

جب ہم آیات میں غور کرتے ہیں تو ہمیں اس نہی کا ارشادی ہونا معلوم ہوتا ہے، گویا اللہ نے آدم وحوا علیہا السلام کو یہ حکم مولا اور حکم ہونے کی بنا پر نہیں دیا تھا بلکہ ایک ناصح اور مشفق کی بنا پر دیا تھا کہ اگر اس درخت سے پرہیز کروگے تو ہمیشہ جنت میں رہو اور دنیا کے آلام سے محفوظ رہوگے، ورنہ زحمتوں کا شکار ہو جاؤ گے۔

"فَقُلْنَا يَـٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَـٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰٓ ﴿١١٧﴾ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا۟ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾ "[1]

نہی کے ارشادی ہونے کے قرائن آیات قرآن میں حسب ذیل ہیں:

ا۔ "فَتَشْقَى" میں فاء نتیجہ کے لئے آئی ہے، مقصد یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی اس مخالفت کا نتیجہ شقاوت اور بدبختی ہے، پھر اس کے بعد کی آیت بھی اسی کی تائید کرتی ہے:

"إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾ "[2]

ا۔ سورہ طہ آیت ۱۱۷-۱۱۹

۲۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۱۱۸

گویااس آیت نے اس بد بختی کی تفصیل بیان کی ہے،یعنی اس نہی کی مخالفت پر کوئی اخروی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبیعی اثر شقاوت ہے جو اثر وضعی ہے اور یہ دلیل ہے کہ نہی ارشادی ہے،ورنہ نہی مولوی میں مواخذہ حتمی ہے، جس کا آیات میں کوئی ذکر نہیں ہے،اس کے علاوہ یہ کہ نہی مولوی کی مخالفت انسان کو اللہ کے قرب سے دور بھی کرتی ہے، جو عصمت کے منافی ہے جبکہ نہی ارشادی میں ایسا کچھ نہیں ہے۔

۲۔دوسری دلیل یہ ہے کہ شیطان نے بھی حضرت آدم علیہ السلام سے آکر ان کی خیر خواہی کا حوالہ دیا، جو دلیل ہے کہ اس حکم کا تعلق اللہ کی مولویت سے نہیں تھا بلکہ اللہ نے خیر خواہی کی بناپر آدم علیہ السلام کو حکم دیا تھا اسی لئے شیطان نے بھی وہی لفظ استعمال کیا:

"وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّى لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّـٰصِحِينَ ﴿٢١﴾ "[1]

گویا شیطان نے اللہ کی خیر خواہی (ارشاد) کے مقابلہ میں اپنے خو حضرت آدم علیہ السلام کا واقعی خیر خواہ اور مرشد ثابت کیا

۳۔جب حضرت آدم و حوا علیہا السلام نے مخالفت کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ درخت کا پھل کھاتے ہیں ان کے لباس اتر گئے اور شرمگاہیں پتوں سے چھپانی پڑیں تو اس وقت یہ ندا آئی جو نہی کی نصیحت اور ارشاد پر مشتمل ہونے کا ثبوت ہے:

"أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيْطَـٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٢﴾ "[2]

گویا اس ندا میں آدم و حوا علیہا السلام کو وہی پہلی والی نصیحت یاد دلائی گئی: ولا تقربا ھذہ الشجرۃ

۴-اگر نہی مولوی ہوتی تو توبہ کے بعد آدم علیہ السلام کو پھر جنت میں واپس بھیج دیا جاتا جبکہ ایسا کچھ نہیں ہوا،توبہ کے بعد بھی آدم علیہ السلام زمین پر ہی رہے،اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نہی ارشادی تھی۔

بعض مفسرین نے اسمسئلہ کو ترک اولیٰ کہہ کر حل کیا ہے، کہ آدم علیہ السلام نے اللہ کے قطعی حکم کی مخالفت نہیں کی بلکہ صرف ایک ترک اولیٰ انجام دیا ہے اور انبیاء گناہوں سے محفوظ ہیں نہ کہ ترک اولیٰ سے۔

ترک اولیٰ سے مراد نسبی گناہ ہے جو گناہ مطلق کے مقابلے میں ہے۔گناہ مطلق خواہ کوئی بھی انجام دے وہ گناہ ہے جیسے جھوٹ، لیکن گناہ نسبی وہ گناہ ہے جو اصالتاً جائز ہے، لیکن ان کا ناجام دینا انبیاء کی شان کے خلاف ہے، مثلاً گلت کے ساتھ نماز پڑھنا،عام انسان پڑھے تو نماز قبول ہے لیکن انبیاء کے لئے یہ بھی گناہ ہے، جس طرح کسی فقیر کی مدد میں کم پیسہ دینا ایک غریب کے لئے صحیح ہے مگر ایک مالدار انسان کے لئے شائستہ نہیں ہے۔

بعض حجرات نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا ہے کہ جو چیز عصمت کے خلاف ہے وہ شریعت کی خلاف قرزی ہے اور شریعت کا میدان یہ دنیا ہے جہاں انسان مکلف ہوتا ہے، آدم و حوا علیہا السلام تو آسمان پر تھے یعنی اس دنیا میں تھے جو تکلیف اور شریعت کی دنیا نہیں ہے، لہذا اس دنیا میں

۱سورہ اعراف آیت ۲۱

۲۔سورہ اعراف آیت ۲۲

حکم خدا کی مخالفت شریعت کی مخالفت ہے کا مصداق نہیں بن سکتے جو عصمت کے خلاف ہو، ابھی نہ کوئی شریعت آئی تھی اور نہ کوئی نبی یا کتاب اللہ کی جانب سے آئے تھے۔

۲۔ عصمت اور حضرت آدم کی لغزش:

آیت میں ازلال کا لفظ ہے جس کے معنی لغزش میں مبتلا کرنا ہے، اور ہمیشہ لغزش سے مراد گناہ و معصیت نہیں ہوتا ہے بلکہ اگر کوئی انسان اپنے ناصح اور شفیق کی نصیحت پر عمل نہ کرے اور نتیجہ میں مصائب میں گرفتار ہو جائے تو وہ بھی لغزش ہی کہلاتی ہے، لہذا لغزش کا امکان و اطلاق جس طرح مولوی احکام میں ہوتا ہے اسی طرح ارشادی احکام میں بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ تیسرے سوال کا جواب بھی مختلف انداز سے ممکن ہے:

الف: اللہ کے مخلَص بندے وہ ہیں جنہیں اللہ نے برگزیدہ کیا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے "وَٱجۡتَبَيۡنَٰهُمۡ وَهَدَيۡنَٰهُمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ﴿٨٧﴾ "[1]

اور یہ بھی قرآن کی دیگر آیات سے واضح ہے کہ جس دن آدم لغزش میں مبتلا ہوئے تھے اس وقت اللہ نے انہیں برگزیدہ نہیں کیا تھا، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اس وقت برگزیدہ کیا جب انہوں نے کلمات کی تلقین کے بعد توبہ کی جیسا کہ اعلان ہوا:

".....وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾ ثُمَّ ٱجۡتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾ "

لہذا آیات میں آپس میں کوئی تعارض اور ٹکراؤ نہیں، لغزش کا وجود برگزیدہ ہونے سے پہلے ہے، اور برگزیدہ ہونے قبل شیطان کا وسوسہ اور ازلال عصمت کے خلاف نہیں، اور جس آیت میں مخلَصین پر شیطان کے تسلط کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد بھی یہی ہے کہ برگزیدہ ہونے کے بعد شیطان ان پر تسلط نہیں کر سکتا۔

ب: پھر شیطان کے گناہگاروں کو بہکانے اور حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے میں بھی فرق ہے، جس فرق کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے کہ عام لوگوں کو بہکانے کے لئے لفظ "فی" استعمال کی اکہ شیطان لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کرتا ہے "یوسوس فی صدور الناس" جبکہ شیطان کے حضرت آدمن کو بہکانے کو لفظ لام اور الیٰ کے ذریعہ بیان کیا، اور ان حروف کا فرق اہل ادب کی نگاہوں میں واضح ہے:

فوسوس لهما الشيطان

فوسوس اليهما الشيطان

۱۔ سورہ انعام آیت ۸۷

ظاہر ہے کہ فی کا الفظ یہ ثابت کرت اہے کہ شیطان کا وسوسہ دل میں نافذ اور راسخ ہو تا ہے جبکہ لام اور الیٰ سے فقط شیطان کا حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے نزدیک ہونا ثابت ہو تا ہے جو عصمت کے خلاف نہیں ہے۔

ج: تیسرا جواب یہ ممکن ہے کہ آیات میں مخلص بندوں سے شیطان کے تسلط اور روح و جسم پر قبضہ کی نفی کی گئی ہے نہ وسوسہ کی، تسلط کا نتیجہ تصرف ہے روح اور جسم میں جس کی مخلص بندوں سے نفی کی گئی ہے۔ لیکن وسوسہ کا امکان پایا جاتا ہے، اس لئے کہ وسوسہ کا مفہوم ترغیب و تشویق ہے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں شیطان کے وسوسہ اور فریب کا ذکر ہے نہ کہ قبضہ اور تسلط کا۔

۴۔.....وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾ ثُمَّ ٱجۡتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

ظلم سے مراد بھی یہاں لغزش کی طرح جرم اور گناہ و معصیت نہیں ہے اس لئے کہ لغت میں ظلم سے مراد حد سے تجاوز کرنے اور بے موقع کسی کام کو انجام دینے کے ہیں[1]

جو شخص اپنے ناصح کی نصیحت پر عمل نہ کرے اور اپنی مصلحت کے خلاف کوئی کام انجام دے وہ بھی حد سے متجاوز کہلائے گا اور مذکورہ وضاحت کے اعتبار سے ظالم کہلائے گا، لہٰذا ہر ظلم گناہ و معصیت کے مترادف نہیں ہے، اسی بنا پر قرآن نے ظلم بر نفس کو بد عملی کے مقابلے میں الگ شمار کیا ہے:

"وَمَن يَعۡمَلۡ سُوٓءًا أَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهُۥ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورٗا رَّحِيمٗا ﴿١١٠﴾ "[2]

جو لوگ تنہا اپنی عقل و روائے پر اعتماد کرتے ہیں وہ اپنے دلسوز ناصحین کی رائے پر عمل نہ کرنے کی صورت میں برے انجام میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور انکی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے اس تفصیل کے لحاظ سے آیات میں ظلم عصمت کے خلاف نہیں ہے۔

۵۔ عصمت حضرت آدم علیہ السلام اور یہ الفاظ: عصیٰ، غویٰ

لفظ عصی اور عصیان آج کی اصطلاح میں تو جرم اور گناہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ الفاظ نزول قرآن کے زمانے میں بھی گناہ کے معنی میں آتے تھے یا نہیں؟ یا اس زمانے میں اس کے معنی وسیع تھے جس کا ایک مصدق گناہ تھا نہ کہ تنہا مصداق گناہ تھا، ابن منظور لسان العرب میں کہتے ہیں:

"عصیان کے معنی اطاعت کی مخالفت کے ہیں"

۱۔ ابن منظور لسان العرب میں کہتے ہیں: ظلم کسی شی کو اس کی مناسب جگہ سے ہٹ کر رکھنا ہے اور کہتے ہیں کہ ظلم حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

۲۔ سورہ نساء آیت ۱۱۰

اور ظاہر ہے کہ ہر مخالفت بھی اصطلاحی طور پر گناہ کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ امر مولوی کی مخالفت گناہ شمار ہوتی ہے جو عصمت کے خلاف ہے، لیکن امر ارشادی کی مخالفت گانہ کا درجہ نہیں رکھتی، جس طرح امر استحبابی یا نہی جو کراہت پر مشتمل ہو اگر کوئی اس کی مخالفت کرے تو وہ بھی گناہ کا درجہ نہیں رکھتی، لہٰذا لفظ عصیٰ آیت میں گناہ کی دلیل نہیں بن سکتا۔

غویٰ کا لفظ بھی لغت عرب میں متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے: خسارہ، تباہ ہو جانا، گمراہ ہو جانا وغیرہ۔

ابن منظور نے تینوں معانی کا ذکر کیا ہے۔

اور طاہر ہے کہ ان تینوں معانی میں سے جس معنی کو بھی آپ مراد لیں وہ گناہ کے مترادف نہیں ہے۔

پہلے معنی کی بنا پر ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس مخالفت کی بنا پر جنت کی آسائشوں سے محروم ہو گئے، گویا خسارہ میں مبتلا ہو گئے ۔اسی طرح ان کی زندگی کے نظام میں خلل اور ایک طرح کی تباہی آگئی (معنی دوم)

اور نتیجہ یہ ہوا کہ سعادت کے راستہ کو حضرت آدم علیہ السلام نے گم کر دیا گویا اپنی زندگی کے راستے کو طے کرنے میں گمراہ ہو گئے (معنی سوم)

مذکورہ تینوں معانی میں سے کوئی بھی گناہ کا ثبوت نہیں۔

۶۔ فتاب علیہ سے مراد

حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں یہ لفظ دو بار استعمال ہوا ہے ایک سورہ بقرہ میں اور دوسرے سورہ طٰہٰ میں اور دونوں جگہ فتاب علیہ کا فاعل اللہ ہے، نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام۔

لغت عرب میں یہ لفظ ہمیشہ علیٰ یا الیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، اگر علیٰ کے ساتھ استعمال ہو تو مراد کسی عظیم ہستی کا عظیم کی بارگاہ میں ندامت اور پشیمانی کے ساتھ رجوع کرنا ہوتا ہے، اسی بنا پر قرآن مجید میں لفظ تواب اللہ اور بندوں دونوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے بہر حال توبہ کے معنی لغت عرب میں مطلق رجوع کے ہیں۔

قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ علیٰ کے ساتھ آیا ہے وہاں رجوع کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے۔

توبہ آیت ۱۱۷

اور بندوں کے لئے الی کے ساتھ استعمال ہوا ہے:

تحریم آیت ۸

نتیجہ یہ کہ آیات میں کہیں بھی گناہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا ذخر نہیں ہے بلکہ اللہ کے رجوع کا ذکر ہے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف، جو اللہ کی بندے پر رحمت کی نشانی ہے، لہٰذا آیت میں ایک جملہ پوشیدہ ہے: سورہ بقرہ آیت ۳۷

یعنی تاب آدم الی اللہ فتاب اللہ علیہ یعنی نے اللہ کی بارگاہ میں ندامت کے ساتھ رجوع کیا تو اللہ نے بھی رحمت کی نگاہوں سے آدم علیہ السلام کی طرف رجوع کیا، گویا نگاہ رحمت کی۔

اور ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ ندامت گناہ کا ثبوت نہیں ہے، اس لئے کہ انبیاء اور اولیاء اللہ جن کی معرفت کا درجہ بلند ہوتا ہے وہ اپنی خدائی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی راہ میں خدا کی بارگاہ میں اپنے کو ہمیشہ مقصر جانتے تھے، اسی لئے ہمیشہ ان کی زندگی میں توبہ و استغفار سے معمور ہوتی تھی۔ یہاں بھی حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کے امر ارشادی اور نصیحت کی مخالفت کا وہ احساس ہوا جس کی بنا پر انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں اظہار ندامت کیا۔

۷۔ آیت میں مغفرت سے مراد: وان لم تغفر لنا

غفران مصدر لغت عرب میں چھپانے کی معنی میں ہے لہٰذا مغفرت سے مراد چھپانے کی درخواست ہے اور چھپانا، عمل کے صحیح نہ ہونے کی نشانی تو ہے لیکن عمل کے یقینی طور پر گناہ ہونے کی علامت نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا عمل ان کی شان کے مطابق نہیں تھا اسی لئے علماء نے اس کے لئے ترک اولیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اسلئے حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ سے اسے چھپانے کی درخواست کی اور اسکے نقصان سے نجات مانگی:

سورہ اعراف آیت ۲۳

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کے خلاف دوسرا ثبوت

منکرین عصمت کے پہلے شبہہ کی تفصیل اور اس کا جواب بیان کیا گیا۔

اب ہم ان کا دوسرا شبہہ اور اعتراض یہاں نقل کرتے ہیں، دوسرے اعتراض میں انہوں نے جن آیات قرآنی کو سند بنایا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّىٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِۦ ۖ فَلَمَّآ أَثْقَلَت دَّعَوَا ٱللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ ءَاتَيْتَنَا صَٰلِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ ٱلشَّٰكِرِينَ ﴿١٨٩﴾

فَلَمَّآ ءَاتَىٰهُمَا صَٰلِحًا جَعَلَا لَهُۥ شُرَكَآءَ فِيمَآ ءَاتَىٰهُمَا ۚ فَتَعَٰلَى ٱللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٩٠﴾

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾

وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَآ أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾

استدلال:

منکرین عصمت نے پہلی آیت میں "نفس واحدۃ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور "زوجھا" سے مراد حضرت حوا علیہا السلام کو لیا ہے، پھر ظاہر ہے کہ دوسری آیت میں تثنیہ سے مراد بھی حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہیں۔

اور دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہوا کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ نے ایک نیک فرزند عطا کیا اور آدم و حوا علیہما السلام دونوں اس فرزند کے بارے میں شرک میں مبتلا ہو گئے، اور شرک عصمت کے خلاف ہے۔

جواب:

مذکورہ استدلال کی بنیاد اس بات پر قائم ہے کہ "نفس واحدۃ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور زوجھا سے مراد حضرت حوا علیہا السلام کو لیا جائے، گویا وہ نفس جو معین اور مشخص ہے حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور پھر ظاہر ہے کہ بعد کی تثنیہ ضمیروں کا مرجع بھی آدم و حوا علیہما السلام ہی قرار پائیں گے، اور شرک کا فاعل بھی۔

لیکن اگر نفس واحدۃ سے مراد کوئی معین اور مشخص نفس نہ لیا جائے بلکہ اس سے مراد ہر انسان کے اپنے اپنے ماں باپ ہوں تو پھر بعد کی تثنیہ کی ضمیروں کا تعلق بھی ہر انسان کے ماں باپ کی جانب ہو گی، اور ان ضمیروں یا شرک کا کوئی تعلق حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے نہ ہو گا۔

اور گویا آیات کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہر ماں باپ مشکلات میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور جب ان کی مشکل حل کر دی جاتی ہے تو پھر وہ اللہ کو بھول کر شرک کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

اب ہم کو یہاں پر یہ ثابت کرنا ہو گا کہ "نفس واحدۃ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ یہاں مراد" ہر انسان کے ماں باپ "ہیں۔

گویا آیت خاد طور سے حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کو بیان نہیں کر رہی ہے بلکہ جملہ انسانوں کی اپنی اولاد کے بارے میں ایک عام سنت کی حکایت کر رہی ہے۔

اگرچہ "نفس واحدۃ" سے مراد قرآن میں نفس معین اور مشخص بھی دکھائی دیتے ہیں یعنی یہی لفظ قرآن میں اپنے مخصوص قرائن کے ساتھ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے لئے بھی آیا ہے جیسا کہ آیت ہے:

"يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً......۞ "[۱]

۱۔ سورہ نساء آیت ۱

"يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ ....(۱۳) "[۱]

لیکن یہی لفظ قرآن میں عام والدین (خواہ کسی بھی فرد بشر کے ہوں) کے لئے بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ آیت حسب ذیل ہے:

"خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ ٱلْأَنْعَـٰمِ ثَمَـٰنِيَةَ أَزْوَٰجٍ ۚ يَخْلُقُكُمْ فِى بُطُونِ أُمَّهَـٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِى ظُلُمَـٰتٍ ثَلَـٰثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ ٱللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ ٱلْمُلْكُ ۖ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ (۶) "[۲]

اس آیت میں نفس واحدۃ سے مراد "عام ماں باپ" ہیں جس کی دلیل مذکورہ آیت کا یہ جملہ ہے: "يَخْلُقُكُمْ فِى بُطُونِ أُمَّهَـٰتِكُمْ "

عام ماں باپ مراد ہونے کے دلائل:

اب ہم یہاں پر مخالفین کی پیش کردہ آیت کے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کے بجائے عام ماں باپ ہیں، اور اس دعے کی دلیل میں ہمارے پاس حسب ذیل مطالب موجود ہیں:

الف: یہ آیت سورہ اعراف کی ہے، اس سورے میں انسان سے لئے گئے عہد وپیمان کا ذکر ہے جسے انسان نے پائمال کیا، اور وہ عہد وپیمان حسب ذیل ہیں:

۱. "يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا .... (۲۶) "[۳]
۲. يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيْطَـٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ .... (۲۷) [۴]
۳. يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ خُذُوا۟ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ ....[۵]

۱۔ سورہ حجرات آیت ۱۳
۲ سورہ زمر آیت ۶
۳۔ سورعہ اعراف آیت ۲۶
۴۔ سورہ اعراف آیت ۲۷
۵۔ سورہ اعراف آیت ۳۱

۴. يَـٰبَنِيٓ ءَادَمَ إِمَّا يَأۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٞ مِّنكُمۡ .... ﴿٣٥﴾ [۱]

۵. وَإِذۡ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِيٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمۡ .... ﴿١٧٢﴾ [۲]

۶. هُوَ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٖ وَٰحِدَةٖ وَجَعَلَ مِنۡهَا .... ﴿١٨٩﴾ [۳] "

مذکورہ آیات میں ان عہدوں کا ذکر ہے جو جملہ انسانوں کو فطرت یا زبان سے لیا گیا ہے، لیکن مقام عمل میں انسانوں نے ان تمام عہدوں کو فراموش کر دیا ہے اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا کہ انسان مشکلات میں گرفتار ہو کر اللہ کو پکارتا ہے مثلاً اس سے اولاد صالح کی درخواست کرتا ہے، اور جب اولاد صالح بھی عطا کر دی جاتی ہے تو شرک کا راشتہ اختیار کرتا ہے، چنانچہ آیت کا تعلق تمام نوع انسانی اور تمام والدین سے ہو گا نہ صرف حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے۔

ب: آیت کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ صالح اولاد کی درخواست کرنے والا وہ ہے جس نے صالح اور غیر صالح اولاد کا تجربہ کر لیا ہے اور زندگی اور معاشرہ میں دونوں طرح کی اولاد کے آثار و نتائج کو اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے جس کی بنا پر اللہ سے صالح اولاد کی درخواست کی ہے اور اس درخواست کے پورا ہونے پر یہ عہد کیا ہے کہ اللہ کے شاکر بندوں میں شامل ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ آیت کا یہ مضمون حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے کسی طرح بھی متعلق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان لوگوں سے متعلق ہو گا جن کی زندگی کا تعلق سماج و معاشرہ سے ہے۔

ج: آیت کا تتمہ دلیل ہے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام مراد نہیں ہیں بلکہ عام والدین مراد ہیں:

فتعالی اللہ عما یشرکون

آیت میں تثنیہ (یشرکان) کے بجائے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے جو دلیل ہے کہ عام افراد بشر مراد ہیں، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ آیت میں گذشتہ الفاظ تثنیہ پر مشتمل ہوں اور یہ ایک لفظ جمع استعمال ہو۔

د: آخری بات یہ ہے کہ عصمت انبیاء کا مسئلہ اگرچہ متکلمین کے درمیان اختلافی ہے اور مسلمانوں کی اقلیت انبیاء کو بعض گناہوں کے مقابلے میں معصوم نہیں مانتی، لیکن اس کے باوجود تمام متکلمین اسلام کا اتفاق ہے کہ انبیاء زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں شرک میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔

جملہ "فجعلالہ شرکاء فیما آتیھما" میں شرک سے مراد شرک در عبادت ہے، اگر اس کا تعلق حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے ہو تو گویا شرک در عبادت کی نسبت ایک برگزیدہ نبی کی جانب دی جا رہی ہے، حالانکہ انبیاء ہمیشہ شرک سے محفوظ ہیں۔

۱۔ سورہ اعراف آیت ۳۵

۲۔ سورہ اعراف آیت ۱۷۲

۳۔ سورہ اعراف آیت ۱۸۹

چنانچہ قرآن صراحت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کو اس انقلاب روحی کے بعد ایک برگزیدہ اور ہدایت یافتہ فرد قرار دے رہا ہے:

"ثُمَّ ٱجۡتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾ "[1]

اور جسے اللہ ہدایت یافتہ قرار دے دے وہ گمراہ نہیں ہو سکتا:

"وَمَن يَهۡدِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِن مُّضِلٍّ .... ﴿٣٧﴾ "[2]

قرآن اور عصمت حضرت نوح علیہ السلام

آیات موضوع

فَأَنجَيۡنَٰهُ وَأَهۡلَهُۥٓ إِلَّا ٱمۡرَأَتَهُۥ كَانَتۡ مِنَ ٱلۡغَٰبِرِينَ ﴿٨٣﴾ (سورہ اعراف آیت ۸۳)

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُۥ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي وَإِنَّ وَعۡدَكَ ٱلۡحَقُّ وَأَنتَ أَحۡكَمُ ٱلۡحَٰكِمِينَ ﴿٤٥﴾ "سورہ ہود آیت ۴۵

قَالَ يَٰنُوحُ إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَ ۖ إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيۡرُ صَٰلِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌ ۖ إِنِّيٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلۡجَٰهِلِينَ ﴿٤٦﴾

قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ أَنۡ أَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِي بِهِۦ عِلۡمٌ ۖ وَإِلَّا تَغۡفِرۡ لِي وَتَرۡحَمۡنِيٓ أَكُن مِّنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿٤٧﴾

.........قُلۡنَا ٱحۡمِلۡ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ ٱثۡنَيۡنِ وَأَهۡلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيۡهِ ٱلۡقَوۡلُ وَمَنۡ ءَامَنَ ۚ وَمَآ ءَامَنَ مَعَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾ (سورہ ہود آیت ۴۰)

.... وَلَا تُخَٰطِبۡنِي فِي ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ ۚ إِنَّهُم مُّغۡرَقُونَ ﴿٣٧﴾

..........يَٰبُنَيَّ ٱرۡكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ ٱلۡكَٰفِرِينَ

وَلَوۡلَآ أَن ثَبَّتۡنَٰكَ لَقَدۡ كِدتَّ تَرۡكَنُ إِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾

۱سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۲

۲۔ سورہ زمر آیت ۳۷

يَعِظُكُمُ ٱللَّهُ أَن تَعُودُواْ لِمِثۡلِهِۦٓ أَبَدًا .... ﴿١٧﴾

وَنَجَّيۡنَـٰهُ وَأَهۡلَهُۥ مِنَ ٱلۡكَرۡبِ ٱلۡعَظِيمِ ﴿٧٦﴾ (سورہ صافات آیت۷۶)

وَقَالَ نُوحٞ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى ٱلۡأَرۡضِ مِنَ ٱلۡكَٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرۡهُمۡ يُضِلُّواْ عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓاْ إِلَّا فَاجِرٗا كَفَّارٗا ﴿٢٧﴾

آیات

تفسیر آیات:

مخالفین عصمت نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا ہے:

"وَنَادَىٰ نُوحٞ رَّبَّهُۥ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي وَإِنَّ وَعۡدَكَ ٱلۡحَقُّ وَأَنتَ أَحۡكَمُ ٱلۡحَٰكِمِينَ ﴿٤٥﴾

"سورہ ھود آیت۴۵)

قَالَ يَٰنُوحُ إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَۖ إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيۡرُ صَٰلِحٖۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌۖ إِنِّيٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلۡجَٰهِلِينَ ﴿٤٦﴾

قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ أَنۡ أَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِي بِهِۦ عِلۡمٞۖ وَإِلَّا تَغۡفِرۡ لِي وَتَرۡحَمۡنِيٓ أَكُن مِّنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿٤٧﴾"

مخالفین حسب ذیل مطالب کے ذریعہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں استدلال کیا ہے:

نوح نے دعویٰ کیا کہ میرا بیٹا میرے خاندان سے ہے:

"إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي "

لیکن اللہ نے نوح علیہ السلام کی تکذیب کی اور کہا "إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَۖ "تمہارا بیٹا تمہارے خاندان سے نہیں ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے واقع کے خلاف بات کہی اور یہی خطا ہے کہ انسان تشخیص میں دھوکہ کھا جائے اور خطا عصمت کے خلاف ہے۔

ب:اسی طرح یہ جملہ "فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌۖ إِنِّيٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلۡجَٰهِلِينَ

یہ جملہ دلیل ہے کہ نوح نے اللہ سے ایسی درخواست کی تھی جو انبیاء کی شان کے خلاف ہے،اور قرآن نے نوح کی گویا ملامت کرتے ہوئے انہیں اس قسم کی درخواست سے منع کیا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی درخواست جس کا سرچشمہ جہالت ہو انبیاء کی عصمت سے منافات رکھتی ہے۔

ج:اسی طرح یہ جملے ہیں:"وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِيٓ أَكُن مِّنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٤٧﴾" :

یہ جملے دلیل ہیں کہ اگر نوح کی مذکورہ درخواست (بیٹے کی نجات کے لئے) لغزش نہ ہوتی تو وہ اللہ سے اس کے بعد مغفرت اور رحمت کی درخواست نہ کرتے،اور لغزش کے بعد یہ درخواست عصمت کے خلاف ہے۔

جوابات

الف: حضرت نوح علیہ السلام نے واقع کے خلاف بات کہی یا نہیں کہی؟

اس بارے میں دو جوابات دئے جارہے ہیں:

۱۔ اللہ نے پہلے ہی حضرت نوح علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کے تمام اہل خانوادہ کو نجات دے گا(سوائے ان لوگوں کے جن کی ہلاکت پہلے سے یقینی ہو چکی تھی) جیسا کہ آیت ہے:

".........قُلْنَا ٱحْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ ٱثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ ٱلْقَوْلُ ....﴿٤٠﴾ [1]"

نوح نے لفظ "اھلک" سے ایک وسیع معنی سمجھے کہ خداوند عالم ان کے تمام اعضاء خانوادہ کو نجات دے گا خواہ مومون ہوں یا کافر ،سوائے ان کی زوجہ کے جن کی ہلاکت پہلے سے یقینی ہو چکی تھی (اور اسی لئے آپؑ نے زوجہ کی نجات کا مطالبہ نہیں کیا)۔

جب نوح نے اپنے بیٹے کو ڈوبتا ہوا دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ آخر اللہ کا وعدہ تو سچا ہے، پھر میرا بیٹا کیوں ہلاک ہو رہا ہے، چنانچہ انہوں نے اللہ سے درخواست کی، گویا جناب نوح علیہ السلام کی نگاہ میں " اھلک " سے مطلق معنی "تمام اہل خانوادہ" مراد تھے۔ خواہ مومن ہوں یا کافر۔ اسی لئے انہوں نے دعا میں اللہ کے اس وعدہ کا حوالہ دیا، گویا نوح نے اللہ کی بارگاہ میں صرف حقیقت امر کے جاننے کی درخواست کی۔

اور اللہ نے بھی ان کی درخواست کا یہ کہہ کر جواب دیا:

انہ لیس من اھلک

گویا اللہ نے یہ بتا دیا کہ ہماری مراد اھلک سے صرف وہ افراد خانوادہ ہیں جو تم پر اور ہم پر ایمان لا چکے ہیں، اور صرف جسمانی رشتہ کافی نہیں ہے۔

۱۔ سورہ ھود آیت ۴۰

اگر اھلک سے مراد بہ طور مطلق تمام اعضاء خانوادہ ہوں تو پھر إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيۡهِ ٱلۡقَوۡلُ یعنی اس مستثنٰی سے مراد صرف حضرت نوح علیہ السلام کی زوجہ قرار پائے گی۔

ہمارے نزدیک مخالفین عصمت کی مذکورہ دلیل کا یہ جواب متعدد اعتبارات سے ناقص ہے:

الف: ایک اولوالعزم رسول (نوح علیہ السلام) سے بعید ہے کہ وہ لفظ اھلک سے اپنے تمام اعضاء خانوادہ کا بہ طور مطلق ارادہ کریں خواہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ خود نوح علیہ السلام نے اللہ سے پہلے یہی خواہش اور درخواست کی تھی کہ روی زمین پر تمام کفار کو نیست و نابود کردے (بہ طور مطلق)۔

"........رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى ٱلۡأَرۡضِ مِنَ ٱلۡكَٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرۡهُمۡ يُضِلُّواْ عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓاْ إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ "[۱]

لہٰذا یہ یقین ہے کہ نوح علیہ السلام نے لفظ اھلک سے صرف باایمان اہل خانوادہ ہی کو سمجھا۔

ب: اسی طرح کوئی دلیل نہیں ہے کہ نوح علیہ السلام نے مستثنٰی "إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيۡهِ ٱلۡقَوۡلُ "سے صرف اپنی زوجہ کو سمجھا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ جملہ بھی نوح علیہ السلام کے تمام کافر اعضاء خانوادہ کو شامل ہے۔ جو نوح علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے بلکہ انہوں نے نوح علیہ السلام ہمیشہ کٹ حجتی کی۔

ج: اللہ نے پوری صراحت کے ساتھ نوح سے کہا تھا کہ ظالم اور ستمگر افراد سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔

"............ وَلَا تُخَٰطِبۡنِي فِي ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ إِنَّهُم مُّغۡرَقُونَ ﴿٣٧﴾ "[۲]

لہٰذا اس جملہ سے مراد "إلا مَن سَبَقَ عَلَيۡهِ ٱلۡقَوۡلُ " یہی ہے کہ اگر میں تم سے تمہارے خاندان کی نجات کا وعدہ کیا ہے اور انہیں بھی کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ ظالمین اور کافرین میں سے نہ ہوں، ورنہ ان کی ہلاکت قطعی امر ہے۔

چنانچہ مخالفین عصمت کی دلیل کا مذکورہ جواب مستحکم نہیں ہے، اب ہم یہاں پر مخالفین کی دلیل کا دوسرا جواب دیتے ہیں جو بہت حد تک مستحکم ہے۔

۲۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا ظاہر میں مومن اور باطن میں کافر تھا، اسی لئے نوح نے جب اپنے مومن رشتہ داروں کو کشتی میں سوار کیا تو بیٹے سے بھی سوار ہونے کو کہا:

---

۱. سورہ نوح آیت ۲۶-۲۷

۲۔ سورہ ھود آیت ۳۷

"..........یَٰبُنَیَّ ٱرۡكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ ٱلۡكَٰفِرِينَ "[۱]

نوح بیٹے سے یہ نہیں کہا کہ کافرین میں سے مت ہو جا:

"وَلَا تَكُن مِنَ ٱلۡكَٰفِرِينَ "

بلکہ کہا کہ کافرین کے ساتھ مت ہو جا"وَلَا تَكُن مَّعَ ٱلۡكَٰفِرِينَ "اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ باپ کو اپنے بیٹے کے ایمان کا یقین تھا۔اور نوح اپنے بیٹے کو مومن سمجھتے تھے،ورنہ بلانے میں لفظ "مع" کے بجائے لفظ "من" لاتے۔

اسی لئے جب انہوں نے بیٹے کو ڈوبتے ہوئے دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی اور کاہ کہ کیسے میرا بیٹا سیلاب کا نشانہ بن گیا جبکہ وہ تو مومن اور موحد تھا،اور اللہ نے اہل ایمان کی نجات کا مجھ سے وعدہ کیا ہے،اور اس کا وعدہ حق ہے۔

چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنے انہیں خیالات کو دعا کی شکل میں بارگاہ خدا میں پیش کردیا:"رَبِّ إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي "اللہ نے بھی جواب دیا کہ تمہارا خیال بیٹے کے ایمان کے بارے میں غلط ہے،وہ مومن نہیں ہے۔

اسی لئے اس کا غرق ہونا ہمارے وعدہ نجات کے خلاف نہیں۔

ہمارا وعدہ نجات اہل ایمان کے بارے میں اپنی جگہ پر ابھی بھی برحق ہے۔

اس بنا پر نہ تو نوح نے جھوٹ یا واقع کے خلاف کچھ کہا اور نہ انہوں نے اللہ کے بارے میں وعدہ خلافی کی بدگمانی کی،بلکہ وہ بیٹے کے بارے میں ایک غلط خیال کے مرتکب تھے جس کو اللہ نے ان کے سامنے روشن کردیا"إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَ "

اس بنا پر نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے کی نجات کی درخواست بھی نہیں کی جو نبی کی شان کے خلاف ہو اور ان کی عصمت پر اعتراض کیا جائے۔

ایک وضاحت

یہاں پر اللہ کے جواب کے بارے میں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے پوری صراحت کے ساتھ (تاکید کے ساتھ) یہ کہا کہ کنعان تمہارے خاندان یا خانوادہ سے نہیں ہے"إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَ ۖ " پھر اس کی وجہ بیان کی:"إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيۡرُ صَٰلِحٍ "یہ نفی اہلیت اور اس کی یہ علت دلیل ہے کہ کسی بھی خانوادہ سے ہونے کے لئے صرف نسبی رشتہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ روحانی اور فکری ہماہنگی کا رشتہ بھی ضروری ہے۔

۱۔ سورہ ھود آیت ۴۲

لہٰذا اگر کوئی نسبی اعتبار سے بیٹا بھی ہو لیکن باپ سے فکری ہماہنگی نہ رکھتا ہو تو وہ اس کے اہل میں سے نہیں ہے "بشرطیکہ باپ کی فکر حق ہو"۔

اور اگر کوئی نسب اور قرابتدار کے اعتبار سے دوری بھی رکھتا ہو مگر فکری اور روحانی ہماہنگی کے اعتبار سے قریب ہو تو وہ تمہارے اہل میں شمار کیا جائے گا۔

جس طرح سلمان فارسی کو قرابت کی دوری کے باوجود ایمان اور فکری ہماہنگی کی بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت میں شامل فرمایا اور کہا: "سلمان منا اهل البیت "سلمان ہم اہل بیت کی ایک فرد ہیں۔

اور ابو لہب حقیقی چچا ہونے کے بعد بھی فکری ہماہنگی نہ رکھنے کی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بد دعا کا مصداق قرار پایا اور اللہ نے بھی اس کی مذمت میں سورہ مسد نازل فرمایا "تبت یدا ابی لهب"

یہ قانون مادی دنیا اور مادیت پرست معاشروں میں ملتا ہے کہ قرابت داری اور خاندان کی فرد ہونے کا معیار رشتہ حسب و نسب ہے لیکن اسلام کی نگاہ میں قرابت داری کے لئے فکری ہماہنگی بھی ضروری ہے، جیسا کہ قرآن نے اہل ایمان کو نبی کے اہل میں شمار کیا ہے:

حضرت لوط کا قصہ:

"فَأَنجَيْنَـٰهُ وَأَهْلَهُۥٓ إِلَّا ٱمْرَأَتَهُۥ كَانَتْ مِنَ ٱلْغَـٰبِرِينَ ﴿٨٣﴾ "[1]

خود حضرت نوح کا قصہ:

"وَنَجَّيْنَـٰهُ وَأَهْلَهُۥ مِنَ ٱلْكَرْبِ ٱلْعَظِيمِ ﴿٧٦﴾ "[2]

مذکورہ دونوں آیتوں میں لفظ "اهله" نبی کے خاندان کے ساتھ ساتھ تمام اہل ایمان کو بھی شامل ہے جنہیں عذاب سے نجات حاصل ہوئی ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا ہی بیٹا تھا، لیکن جب اس نے اللہ کی نافرمانی کی تو اللہ نے اسے نوح کی ولدیت سے خارج کر دیا، اسی طرح ہماری اولاد بھی اگر کوئی اللہ کی اطاعت نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے۔

پھر آپؑ نے راوی کی جانب نگاہ کی اور کہا کہ تم بھی اگر اللہ کی اطاعت کرو گے تو ہم اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے قرار پاؤ گے "[3]

۱۔ سورہ اعراف آیت ۸۳

۲۔ سورہ صافات، آیت ۷۶

۳۔ نور الثقلین، ج ۲ ص ۳۷۰

اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن میں لفظ "اھل" سے مراد ہر جگہ صرف اہل ایمان ہی ہیں، بلکہ متعدد مقامات پر لفظ اہل قرآن میں ان لوگوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جن کا رشتہ صرف مادی اور جسمانی ہے، جیسا کہ خود مذکورہ آیہ کریمہ ہے: "وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ ٱلْقَوْلُ" اس آیت میں استثناء متصل ہے، جو دلیل ہے کہ زوجہ نوح بھی انکے اہل میں سے ہے جس کا رشتہ حضرت نوح علیہ السلام سے صرف سببی اور مادی ہے۔

اسی طرح سے حضرت لوط علیہ السلام سے متعلق گذشتہ آیت میں ہے۔

مخالفین کی دوسری دلیل کا جواب

یہ بات صحیح ہے کہ خداوند عالم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایسی چیز کا سوال کرنے (یا درخواست کرنے) سے روکا ہے جس کا علم نہیں کرتے، یعنی جس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں، اور جس کی درخواست در حقیقت جہالت کی علامت ہے۔ لیکن روکنے کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ ایسی غلطی حضرت نوح علیہ السلام سے صادر ہوئی ہے۔ چنانچہ اللہ نے جب نوح علیہ السلام کو ایسے حالات میں دیکھا کہ نوح علیہ السلام ممکن ہیں کہ یہ درخواست بھی پیش کریں تو اللہ نے انہیں ایسی درخواست سے منع کیا جو جہالت کی نشانی ہے، اور وہ درخواست کافر بیٹے کی نجات پر مشتمل ہے اور نوح کے لئے اس درخواست کے اسباب اس لئے فراہم تھے کہ نوح اپنے بیٹے کے کفر کا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس کا ڈوبنا ان کی نگاہوں میں ایک مومن کا ڈوبنا تھا، جب کہ اللہ نے ان سے ان کے اہل ایمان عزیزوں کی نجات کا وعدہ کیا تھا۔

اس لئے انہوں نے اللہ سے اس کے وعدے کا حوالہ دیتے ہوئے بیٹے کی نجات کی درخواست کی۔ جس کے جواب میں اللہ نے دو باتیں نوح سے کہیں:

ایک تو یہ کہ تمہارا فرزند حقیقت میں کافر ہے نہ کہ مومن، اور اس کے بارے میں تمہارا نظریہ غلط ہے اور کفر کی وہ اس منزل پر ہے کہ عمل غیر صالح کا مجسمہ ہے (یعنی مصدر استعمال کیا جو مبالغہ کی دلیل ہے یعنی گویا وہ مجسم عمل غیر صالح ہے) نہ کہ عمل غیر صالح انجام دینے والا (جس طرح عربی میں زید عدل ہے)

دوسرے یہ کہ اے نوح ہم سے کافر بیٹے کی نجات کی درخواست نہ کرنا۔ کہ ایسی درخواست جہالت کی نشانی اور انبیاء کی شان کے خلاف ہے (جہالت سے مراد حقیقت امر سے ناواقفیت ہے)

اور نوح علیہ السلام نے ایسی درخواست اللہ سے نہیں کی تھی (کہ مطلق طور پر ان کے بیٹے کو نجات دی جائے خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو) اس لئے کہ نوح سے خطاب ہو رہا ہے:

"فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۖ إِنِّىٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلْجَـٰهِلِينَ ﴿٤٦﴾ "

اگر نوح نے اللہ سے مطلق درخواست کی ہوتی تو نوح کا شمار جاہلین میں ہو ہی چکا تھا، جبکہ آیت کے صریحی الفاظ کے مطابق وہ ابھی تک جاہلین میں سے نہیں ہوئے تھے، ورنہ نصیحت بے معنی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ کہا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے اپنی درخواست مطلق طور پر ہی کی تھی (خواہ بیٹا کافر ہی کیوں نہ ہو) اور اللہ نے ایسی درخواست سے جو منع کیا: "فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ "اس کا مفہوم یہ تھا کہ اب ایسی درخواست کی تکرار نہ ہونے پائے، لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے اس لئے کہ اگر مراد یہ ہوتا تو آیت کے الفاظ یہ ہوتے:

"لئلا تعودا الی مثلہ "

جیسا کہ دیگر مقامات پر تکرار سے روکنے کے لئے یہ الفاظ پائے جاتے ہیں:

"يَعِظُكُمُ ٱللَّهُ أَن تَعُودُواْ لِمِثْلِهِۦٓ أَبَدًا .... ﴿١٧﴾ "

چنانچہ جب جناب نوح علیہ السلام پر بیٹے کے ایمان کی حقیقت واضح ہو گئی تو انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا:

"قَالَ رَبِّ إِنِّىٓ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِى بِهِۦ عِلْمٌ "

اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت میں ایسی چیز کا سوال کرنا جس کا علم نہ ہو یعنی کسی مجہول اور مبہم سے کے بارے میں سوال کرنا مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بات تو عام ہے کہ انسان ہمیشہ مجہول شے کے بارے میں ہی سوال کرتا ہے، نہ کہ معلوم چیز کے بارے میں، بلکہ آیت میں سوال نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسی چیز کی درخواست مت کرو جس کی حقیقت اور صلاح و فلاح کے بارے میں تم علم نہیں رکھتے۔

اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ اللہ سے صرف ایسی چیز کا مطالبہ کرے جس کے فائدہ اور نقصان کا اس نے مقائسہ کر لیا ہو اور اس کا فائدہ اس کے نقصان پر غالب ہو۔

ج: مخالفین کی تیسری دلیل کا جواب:

"وَإِلَّا تَغْفِرْ لِى وَتَرْحَمْنِىٓ أَكُن مِّنَ ٱلْخَـٰسِرِينَ ﴿٤٧﴾ "

اس جملہ کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی معنی۔

ظاہری اعتبار سے یہ جملہ توبہ و استغفار ہے، لیکن باطنی اعتبار سے یہ جملہ توبہ کی شکل میں شکر و قدردانی ہے، اس لئے کہ اگرچہ نوح علیہ السلام سے گناہ سرزد نہیں ہوا لیکن گناہ کے اسباب اور حالات فراہم ہو چکے تھے اور وہ گناہ، کافر بیٹے کی نجات کی درخواست ہے۔ اگر لطف خدا نوح علیہ السلام کے شامل حال نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ ایسے بیٹے کی نجات کی درخواست بھی اللہ سے کر دیتے۔ لیکن اللہ نے انہیں ایسی درخواست سے روک کر ان پر کرم کیا جس کا شکرانہ نوح علیہ السلام نے توبہ کے مذکورہ الفاظ میں ادا کیا۔

اور اس طرح اللہ نے انہیں جاہلین کے گروہ میں شمار ہونے سے محفوظ رکھا، اور عصمت کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور ائمہ عصمت کے درجہ پر فائز ہونے کے بعد اللہ کی غیبی امداد اور حفاظت سے بے نیاز ہو جاتے ہوں۔ بلکہ عصمت کی بلند ترین منزل پر ہونے کے باجود وہ ہمیشہ اللہ

کی حفاظت اور تائید کے محتاج رہتے ہیں۔ چنانچہ آخری نبیؐ کے بارے میں اعلان ہے وَلَوۡلَآ أَن ثَبَّتۡنَٰكَ لَقَدۡ كِدتَّ تَرۡكَنُ إِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾

صحیح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی ظالمین پر اعتماد کرنے کے حالات واسباب پیدا ہو گئے تھے لیکن اللہ نے جب پیغمبرؐ کو ثبات قدم اور اطمیان عطا کیا تو وہ اسباب ناکام رہ گئے اور ایسے حالات ختم ہو گئے۔

گویا یہ اللہ کی غیبی امداد ہے جس کی بناپر انبیاء لغزشوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

اگر آپ اس آیت کے دو معنی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہین یعنی ظاہری معنی اور بطانی معنی، بلکہ صرف اس آیت کو توبہ واستغفار پر ہی حمل کرتے ہیں تب بھی انبیاء کی توبہ اور استغفار گناہ کے سرزد ہونے کی نشانی نہیں ہیں، اس لئے کہ انبیاء جب بھی اپنے کاموں کا مقائسہ مقام ربوبیت سے کرتے ہیں تو ان کی زبان پر یہی جملہ ہوتا ہے:

"ماعبدناک حق عبادتک" خدایا! ہم نے تیری عبادت واطاعت کا حق ادا نہیں کیا۔

اس لئے وہ ادنیٰ دے کوتاہی یا مباح کام بھی انجام دیتے ہیں جسے ترک اولیٰ کہا جاتا ہے تب بھی اللہ سے استغفار کرے ہیں کہ ان کی نگاہوں میں یہ ادنیٰ سی کوتاہی بھی شان نبوت کے خلاف ہوتی ہے۔

انبیاء کی توبہ کا فلسفہ وہ نہیں ہے جو ہماری توبہ کا فلسفہ ہے، ہماری توبہ گناہوں پر مبنی ہوتی ہے، اور ان کی توبہ ترک اولیٰ پر، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں گذر چکا ہے۔

۴۔ قرآن اور عصمت جناب یوسف علیہ السلام

آیات موضوع

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَـٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿١٧٤﴾ (سورہ نساء آیت ۱۷۴)

.... مَعَاذَ ٱللَّهِ ۖ إِنَّهُۥ رَبِّىٓ أَحْسَنَ مَثْوَاىَ ۖ إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٢٣﴾ (سورہ یوسف آیت ۲۳)

.... حَـٰشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوٓءٍ ۚ قَالَتِ ٱمْرَأَتُ ٱلْعَزِيزِ ٱلْـَٔـٰنَ حَصْحَصَ ٱلْحَقُّ أَنَا۠ رَٰوَدتُّهُۥ عَن نَّفْسِهِۦ وَإِنَّهُۥ لَمِنَ ٱلصَّـٰدِقِينَ ﴿٥١﴾ (سورہ یوسف آیت ۵۱)

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِۦ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَن رَّءَا بُرْهَـٰنَ رَبِّهِۦ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٢٤﴾ (سورہ یوسف آیت ۲۴)

وَٱسْتَبَقَا ٱلْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُۥ مِن دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا ٱلْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَن يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾ (سورہ یوسف آیت ۲۵)

وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ وَأَنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ (سورہ نور آیت ۱۰)

.... أَءِلَـٰهٌ مَّعَ ٱللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا۟ بُرْهَـٰنَكُمْ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ﴿٦٤﴾ (سورہ نمل آیت ۶۴)

.... فَذَٰنِكَ بُرْهَـٰنَانِ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَإِي۟هِۦٓ ۚ ....﴿٣٢﴾ (سورہ قصص آیت ۳۲)

آیات

تفسیر آیات

سورہ یوسف کی آیات جناب یوسف علیہ السلام کے علم وصبر و تحمل اور عفت وخود داری کو ثابت کرتی ہیں اور حضرت یوسف کو تقویٰ کا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں، اور عفت کے بیش بہا نتائج اس سورے میں بیان کئے گئے ہیں۔

عفت سخت حالات میں:

عام حالات میں عفت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دینا بہت آسان ہے لیکن سخت حالات میں عفت کے دامن سے وابستہ رہنا بہت مشکل ہے۔ ایسے حالات بھی زندگی میں انسان کی پیش آتے ہیں جب عفت کے راستے پر انسان بغیر امداد الٰہی کے گامزن نہیں وہ سکتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے یہاں بھی ایسے ہی اسباب فراہم ہوگئے تھے کہ اگر وہ معصوم نہ ہوتے تو شہوت کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے، اس لئے کہ

یوسف علیہ السلام ایک جوان تھے اور جنسی توانائی کا غلبہ تھا، ایک خوبصورت ترین جوان تھے اور ایک خوبصورت عورت (زلیخا) کے محل میں رہتے تھے جوان کے لئے آرائش کیا کرتی تھے، وہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر روزانہ یوسف سے اظہار عشق کرتی تھے، یہاں تک کہ ایک دن اس نے بند کمرے میں جہاں کوئی نہ آسکے یوسف کے سامنے اپنے کو پیش کر کے کہا: "هیت لک" یعنی میری طرف جلدی کرو۔

اس وقت یوسف علیہ السلام نے کہا:

"مَعَاذَ ٱللَّهِ ۖ إِنَّهُۥ رَبِّىٓ أَحۡسَنَ مَثۡوَاىَ ۖ إِنَّهُۥ لَا يُفۡلِحُ ٱلظَّٰلِمُونَ "[1]

زلیخانے اصرار کیا یہاں تک کہ یوسف کا پیچھا کر لیا، ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جس چیز نے حفاظت کی وہ ان کی عصمت تھی جس نے ایسے حالات میں بھی انہیں خلاف عفت کام کرنے سے روکا اور ان کا مکمل تحفظ کیا۔

صحیح بات یہی ہے، باقی سب اسرائیلیات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے وضع کئے گئے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت اس منزل پر تھی کہ دربار عزیز مصر کی تمام عورتوں نے زلیخا کے ساتھ ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی یہ یک زبان گواہی دی:

"حَٰشَ لِلَّهِ مَا عَلِمۡنَا عَلَيۡهِ مِن سُوٓءٍ ۚ قَالَتِ ٱمۡرَأَتُ ٱلۡعَزِيزِ ٱلۡـَٰٔنَ حَصۡحَصَ ٱلۡحَقُّ أَنَا۠ رَٰوَدتُّهُۥ عَن نَّفۡسِهِۦ وَإِنَّهُۥ لَمِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٥١﴾ "[2]

مخالفین کی دلیل:

مذکورہ تمام باتوں کے باوجود مخالفین عصمت نے اس قصہ میں ایک آیت کو اپنے لئے سند قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ معاذ اللہ حضرت یوسف معصوم نہیں تھے اور وہ آیت یہ ہے:

"وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهِۦ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَآ أَن رَّءَا بُرۡهَٰنَ رَبِّهِۦ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلۡفَحۡشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنۡ عِبَادِنَا ٱلۡمُخۡلَصِينَ ﴿٢٤﴾ "[3]

مخالفین عصمت کا کہنا یہ ہے کہ جملہ "وَهَمَّ بِهَا" دلیل ہے کہ جس طرح زلیخانے گناہ کا ارادہ کیا تھا اسی طرح یوسف نے بھی کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے بعد یقسف نے اللہ کی جانب سے "برہان رب" کا مشاہدہ کیا جس کے نتیجہ میں گناہ سے پرہیز کیا۔

۱۔ سورہ یوسف آیت ۲۳

۲۔ سورہ یوسف آیت ۵۱

۳۔ سورہ یوسف آیت ۲۴

گویاان کے اعتبار سے آیت میں "لولا" کا جواب پوشیدہ ہے اور "وَهَمَّ بِهَا" ایک مستقل جملہ ہے، اور لولا کا پوشیدہ جواب یہ ہے:

لفعل واقترف

گویااس آیت میں دو جملے الگ الگ مستقل ہیں:

۱۔"وَهَمَّ بِهَا": جناب یوسف علیہ السلام نے بھی گناہ کا قصد کیا

۲۔"لَوْلَآ أَن رَّءَا بُرْهَـٰنَ رَبِّهِۦ": "لاقترف"

اگر یوسف نے برہان رب کا مشاہدہ نہ کای ہوتا تو گناہ کے مرتکب ہو جاتے، لہٰذا جملہ "وَهَمَّ بِهَا" یوسف کی عدم عصمت کی دلیل ہے[1]

قائلین عصمت کا جواب:

عصمت کے ماننے والوں نے مخالفین کی مذکورہ دلیل کے جو جوابات دئے ہیں ہم انہیں یہاں پر نقل کر رہے ہیں:

۱۔ لفظ "هَمَّ" آیت میں عزم وارادہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جو عصمت کے خلاف ہو، بلکہ اس لفظ سے مراد صرف گناہ کا دل کے راستے سے گذرنا ہے جو انسان کے اختیار سے باہر ہے۔

چنانچہ صاحب تفسیر روح البیان نے اس نظریہ کو قبول کیا ہے کہ یوسف نے انسانی فطرت اور جوانی کی شہوت کے تقاضے کی بنا پر زلیخا کی جانب کشش پیدا کی، جو انسان کے اختیار سے باہر ہے ورنہ مراد عزم وارادہ گناہ نہیں ہے جو انسان کے اختیار میں ہوتا ہے۔[2]

مذکورہ جواب کی کمزوری:

یہ جواب اس لئے صحیح نہیں ہے کہ یہی لفظ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے استعمال ہوا ہے اسی طرح زلیخا کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، اور دونوں ایک ساتھ آئے ہیں "هَمَّتْ بِهِۦ ۖ وَهَمَّ بِهَا" اگر زلیخا کے کے لئے یہ لفظ عزم وارادہ کے معنی میں ہے جیسا کہ حقیقت ہے تو پھر یوسف کے لئے اس لفظ کے معنی کیوں کر تبدیل ہو جائیں گے، اس طرح آیت کے معنی بیان کرنا ظاہر الفاظ کے خلاف ہے۔

۲۔ شیخ محمد عبدہ نے "هَمَّتْ" کے معنی یہ لئے ہیں کہ زلیخا نے یوسف کو مارنے کا ارادہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ عام طور سے عاشقین کا شیوہ ی ہے کہ جب وہ معشوق کی راہ میں شکست خوردہ ہو جاتے ہیں تو پھر معشوق سے انتقام لینے کی سوچتے ہیں۔ خواہ یہ انتقام زبانی طور پر لیا جائے برا بھلا کہہ کر یا جسمانی طور پر مار پیٹ کے ذریعہ، حتیٰ قتل کی نوبت بھی اس راہ میں آجاتی ہے۔

۱۔ یہ نظریہ فخر رازی نے تفسیر کبیر اور صاحب المنار نے نقل کیا ہے۔ اسرائیلیات میں بھی اس نظریہ کے دلائل پائے جاتے ہیں۔

۲۔ روح البیان، ج۴، ص۲۳۷

زلیخانے بھی یہی طریقہ اپنایا کہ اپنے سرکش معشوق (حضرت یوسف علیہ السلام) سے انتقام لے۔[1]

مذکورہ جواب کی کمزوری

اگر شیخ محمد عبدہ کا جواب درست مان لیا جائے تو پھر اشکال یہ ہے کہ اگر لفظ "هَمَّتۡ "زلیخا کے لئے انتقام کے ارادہ کے معنی میں ہے تو پھر وحدت سیاق وعبارت کی بناپر یوسف کے لئے بھی اس لفظ کے یہی معنی ہونا چاہئے۔اور یہ ناممکن ہے۔

صحیح جواب:

"هَم "لغت عرب میں عزم وارادہ ہی کے معنی میں آیا ہے۔اب یہ عزم و ارادہ کا تعلق کسی چیز سے ہے اس کی تحقیق کلام میں موجودہ قرائن کے ذریعہ ہوگی۔

چنانچہ آیت میں ایسے کسی قرینہ کا ذکر نہیں ہے جس کی بناپر "همت" سے مراد انتقام کا ارادہ ہو۔

قرآن نے دونوں باتوں کا الگ الگ جواب دیاہے:

۱-گناہ سے پرہیز کی وجہ کیا تھی؟

۲۔یوسف نے اس ماحول سے کیسے نجات حاصل کی؟

پہلے کا جواب یہ آیت ہے:

"لَوۡلَآ أَن رَّءَا بُرۡهَـٰنَ رَبِّهِۦۚ كَذَٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلۡفَحۡشَآءَ "

دوسرے سوال کا جواب یہ آیت ہے:

"وَٱسۡتَبَقَا ٱلۡبَابَ وَقَدَّتۡ قَمِيصَهُۥ مِن دُبُرٍ........ "

برہان رب کا تصور:

مندرجہ ذیل آیات نے تمام مفسرین کو مشغول کر دیاہے:

"وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهِۦۖ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَآ أَن رَّءَا بُرۡهَـٰنَ رَبِّهِۦۚ كَذَٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلۡفَحۡشَآءَۚ إِنَّهُۥ مِنۡ عِبَادِنَا ٱلۡمُخۡلَصِينَ ﴿٢٤﴾ "[2]

۱۔المنار، ج۱۲، ص۲۷۸

۲۔سورہ یوسف آیت ۲۴

"وَٱسۡتَبَقَا ٱلۡبَابَ وَقَدَّتۡ قَمِيصَهُۥ مِن دُبُرٍ وَأَلۡفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا ٱلۡبَابِۚ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ أَرَادَ بِأَهۡلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَن يُسۡجَنَ أَوۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾"[1]

جیسا کہ ہم نے عرض کیا: کہ مخالفین عصمت کا کہنا ہے کہ لفظ لولا (جسے عربی ادب میں امتناعیہ کہا جاتا ہے) ایک جواب کا محتاج ہو تا ہے، جس طرح اردو میں کہا جاتا ہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہو تا تو میں غرق ہو جاتا، غرق ہو جانا حقیقت میں جواب ہے پہلے جملہ کا، اور ظاہر ہے کہ پہلا جملہ بغیر دوسرے جملہ کے یہاں پر ناقص ہے۔

عربی میں بھی ایسا ہی ہے کہ لولا کو ایک جواب کی ضرورت ہے اب وہ جواب تین طرح ہو سکتا ہے:

۱۔ یا جواب کلام میں ظاہری طور پر موجود ہو تا ہے جیسے "لولا علی لھلک عمر"

۲۔ یا جواب پوشیدہ ہو تا ہے جو کلام کے قرائن سے سمجھا جاتا ہے، جیسے: "وَلَوۡلَا فَضۡلُ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهُۥ وَأَنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾"

: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہو تا (تو تم سب ہلاک ہو جاتے) اور خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور حکمت والا ہے۔

آیت کے میں قوسین کے درمیان لولا کا جواب ذکر کیا گیا ہے جس کا آیت میں ذکر نہیں ہے بلکہ کلام کے سیاق و سباق اور ر قرائن مقالیہ سے لولا کا یہ جواب معلوم ہوا ہے۔

۳۔ کبھی لولا سے پہلے ولا جملہ ہی قرینہ بنتا ہے پوشیدہ جواب کی تعیین اور تشخیص کے لئے۔ جیسے:

"قد کنت هلکت لولانی نجیتک " تم ہلاک ہو گئے ہوتے اگر میں نے تمہیں نجات نہ دی ہوتی۔

گویا جملہ کی صحیح اور ابی شکل اسی طرح ہے:

لولانی نجیتک قد کنت هلکت

کلام عرب میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ہماری مذکورہ آیت میں بھی لولا کا جواب پوشیدہ ہے جس کی تشخیص پر لولا سے پہلے کا جملہ دلیل ہے۔

آیت کے ظاہری الفاظ تو یہ ہیں:

"وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَآ أَن رَّءَا بُرۡهَٰنَ رَبِّهِۦ" ظاہر ہے کہ آیت میں لولا کو ایک جواب کی ضرورت ہے جو آیت میں ذکر نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا پوشیدہ ماننا ہو گا، اور وہ پوشیدہ جواب لولا سے پہلے جملہ کے ذریعہ معلوم ہو گا اور وہ جملہ "وَهَمَّ بِهَا " ہے، یہ جملہ قرینہ بن کر رہنمائی کر رہا ہے کہ لولا کا پوشیدہ جواب یہ ہے[2]

۱۔ سورہ یوسف آیت ۲۵

۲۔ علماء ادب کا اتفاق ہے کہ لولا کا جواب خود لولا پر مقدم نہیں ہو سکتا، اس لئے لولا سے پہلے کا جملہ لولا کے جواب کا قرینہ ہے نہ کہ خود ہی جواب ہو، اور مقدم ہو گیا ہو۔

گویا جملہ کی صحیح شکل یہ ہے "لَوۡلَآ أَن رَّءَا بُرۡهَـٰنَ رَبِّهِۦ لھم بھا"

اگر یوسف نے برہان رب کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو یوسف بھی گناہ کا ارادہ کر لیتے (زلیخا کی طرح)

چنانچہ آیت میں دو جملے ہیں: ایک مطلق ہے اور دوسرا مشروط۔

پہلا جملہ ہے: "وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهِۦ" جو دلیل ہے کہ زلیخا نے عزم وارادہ کیا۔

لیکن دوسرا جملہ مشروط ہے: "لَوۡلَآ أَن رَّءَا بُرۡهَـٰنَ رَبِّهِۦ لھم بھا" یہ جملہ شرطیہ ہے، جو دلیل ہے کہ برہان رب کی بنا پر یوسف علیہ السلام کے یہاں گناہ کا ارادہ بھی نہیں آسکا، چہ جائیکہ خود گناہ، جیسا کہ امام علی رضا علیہ السلام نے اس تفسیر کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"ان یوسف کان معصوما والمعصوم لا یھم بذنب ولا یاتیہ"[1]

بیشک یوسف علیہ السلام معصوم تھے اور معصوم گناہ کا نہ ارادہ کرتا ہے اور نہ انجام دیتا ہے، لہٰذا آیت نہ صرف یہ کہ یوسف علیہ السلام کی عصمت کے خلاف نہیں ہے بلکہ خود ان کی عصمت کا محکم ثبوت ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی فکری پاکیزگی کا اعلان کر رہی ہے۔

برہان رب سے مراد کیا ہے؟

لغت عرب میں برہان کے معنی حجت، دلیل اور واضح گواہ کے ہیں جس سے حقیقت روشن ہو جائے[2]

ہر وہ چیز جو شک وشبہہ کو قطع کر دے ارو حقیقت کو روشن کرے یعنی مفید علم ویقین ہو اسے برہان کہتے ہیں۔

اسی لئے قرآن نے معجزہ کو برہان سے تعبیر کیا ہے:

"فَذَٰنِكَ بُرۡهَـٰنَانِ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَإِيْهِۦٓ"

:عصا اور ید بیضا یہ دونوں اللہ کی طرف سے فرعون کی طرف جانے کے لئے تمہاری رسالت کے دو گواہ ہیں (یعنی دو معجزے)

اسی طرح قرآن نے خود پیغمبرؐ کو بھی برہان سے تعبیر کیا ہے:

"يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَكُم بُرۡهَـٰنٌ مِّن رَّبِّكُمۡ وَأَنزَلۡنَآ إِلَيۡكُمۡ نُورًا مُّبِينًا ﴿١٧٤﴾"

اس لئے کہ برھان حقانیت کا ثبوت ہوتی ہے، خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود اور ان کی کتاب (قرآن) بھی اسلام کی حقانیت اور اس کے اللہ کی جانب ست ہونے کا ثبوت ہے۔

یہ تھی لغت اور قرآن سے وضاحت برہان کی۔

اب ہم بیان کرتے ہیں کہ آیت میں برہان رب سے مراد کیا ہے؟

اس بارے میں مفسیرن نے متعدد احتمالات دئے ہیں جن میں سے زیادہ تر ضعیف احتمالات ہیں:

۱۔ تفسیر نور الثقلین

۲۔ ابن منظور، لسان العرب ج۱۳ ص۵۱

۱۔ برہان رب سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کا زنا کی حرمت اور عذاب سے آگاہ ہو جانا ہے۔

۲۔ برہان رب سے مراد انبیاء اور خاصان کے فضائل اور کمالات ہیں، اور وہ صفات انہیں گناہ سے بچنے کی دعوت دیتے ہیں۔[۱]

ظاہر ہے کہ صرف زنا کی حرمت اور اس کے عذاب کا علم ایسے حالات میں انسان کے گناہ سے بچنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسی طرح صرف ذاتی اوصاف و کمالات بھی ایسے حالات میں انسان کے گناہ سے بچنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

جب تک کہ ایک خداداد طاقت اس کے پاس نہ پائی جاتی ہو، اسی خداداد طاقت کی تفسیر مفسرین نے مختلف انداز سے پیش کی ہے کسی نے کہا کہ مراد نبوت ہے، کسی کے نزدیک عصمت مراد ہے اور کسی نے امداد غیبی اور لطف خدا سے اس کی تفسیر کی ہے۔

ہمارے اعتبار سے ان تمام تفاسیر کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

البتہ یہ کہنا ممکن ہے کہ برہان رب سے مراد زنا کی حقیقت اور دنیا و آخرت میں اس کے دردناک آثار و نتائج کا نگاہوں میں مجسم ہونا ہے، اور یہ تجسم صرف نبوت و عصمت اور لطف خدا کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔

بعض مفسرین نے برہان رب کی تفسیر میں ایک دوسرے معنی نقل کئے ہیں جو نبوت و عصمت کی شان کے خلاف ہیں اور غالباً اس کی بنا ید اسرائیلی روایات ہیں۔

بعض حضرات نے دعویٰ کیا ہے کہ برہان رب سے مراد تمام دروازوں کا اعجازی طور پر یکبارگی کھل جانا ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے کی آیت میں دروازوں کا بند کرنا ذکر ہوا ہے "وغلقت الابواب و قالت ھیت لک" اور پھر ان دروازوں کے کھلنے کا آیت میں کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے برہان رب سے مراد حکم خدا سے دروازوں کا اچانک کھل جانا ہے۔[۲]

یہ تفسیر بھی الفاظ آیت کے خلاف ہے آیت کے الفاظ یہ ہیں: " وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَن رَّءَا بُرْهَـٰنَ رَبِّهِۦ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُخْلَصِينَ ﴿٢٤﴾ "[۳]

""وَٱسْتَبَقَا ٱلْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُۥ مِن دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا ٱلْبَابِ ۚ قَالَتْ "

دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف کے ذہن میں بس یہی خیال آیا کہ باہر بھاگیں، اس لئے وہ دروازہ کی طرف دوڑ پڑے، زلیخا نے بھی دروازے کی طرف دوڑی تا کہ یوسف کو باہر بھاگنا تھا اور دوسرے کا انہیں روکنا، ایک کی کوشش تھی کہ کسی طرح دروازے کو کھول لے اور دوسرے کی کوشش تھی کہ کسی طرح بھی دروازہ کھلنے نہ پائے، اسی لئے زلیخا نے یوسف کے کرتے کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا جس سے یوسف کا کرتا پشت کی جانب سے پارہ ہو گیا۔

۱۔ مجمع البیان، ج۳ص ۲۲۵

۲۔ تفسیر آیات مشکلہ قرآن

۳۔ سورہ یوسف آیت ۲۴

اگر برہان رب سے مراد آیت میں حکم خدا سے دروازوں کا کھل جانا ہو تو پھر مندرجہ ذیل دو واقعات کا سمجھنا آیت میں مشکل ہو جائے گا:

۱۔اگر دروازہ حکم خدا سے کھل گیا تھا تو دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش کہ پہلے باہر نکل جائے اس کا کوئی فائدہ نہین،اور ایک کا پہلے نکل جانا اس بات کا ثبوت نہیں کہ جو ندر سے بعد میں نکل رہا ہے وہ گناہگار ہے،چاہے ایک لمحہ کا ہی فرق کیوں نہ ہو۔اور ایک لمحہ پہلے نکلنے والا بے گناہ ہے۔

۲۔اگر دونوں کے مسابقہ سے پہلے ہی دروازے کھل چکے تھے تو پھر زلیخا پیراہن کو پکڑ کر کھیچنا اور وہ بھی اس شدت سے کہ وہ پارہ ہو جائے کوئی فائدہ نہیں۔

اسبنا پر صورت واقعہ یہی بتاتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یوسف دروازے کو کھلونے کے لئے اس کی طرف دوڑے تا کہ جلدی سے باہر نکل جائیں،اور زلیخا اسلئے دروازے کی طرف دوڑی کہ دروازے کو کھلنے اور یوسف کو باہر نکلنے سے روک سکے۔

اسی کشمکش میں زلیخا نے یوسف کے پیراہن کو پارہ کر دیا اس کے باوجود یوسف دروازے کو کھولنے میں کامیاب ہو گئے اور باہر نکل گئے۔

اس تفصیل کے بعد برہان رب کی تفسیر میں حکم خدا سے دروازوں کا کھل جانا مراد لینا بے دلیل ہے۔

۵۔ قرآن اور عصمت حضرت موسیٰ علیہ السلام

آیات موضوع

أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا ٱلْأُخْرَىٰ ۚ ﴿٢٨٢﴾ (سورہ بقرہ آیت ۲۸۲)

.... وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾ (سورہ اعراف آیت ۲۳)

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوْمِهِۦ غَضْبَٰنَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِى مِنۢ بَعْدِىٓ ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى ٱلْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُۥٓ إِلَيْهِ ۚ ....(سورہ اعراف آیت ۱۵۰)

.... ٱخْلُفْنِى فِى قَوْمِى وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿١٤٢﴾ (سورہ اعراف آیت ۱۴۲)

.......بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِى مِنۢ بَعْدِىٓ ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ ....(سورہ اعراف آیت آیت ۱۵۰)

......وَلَمَّا سُقِطَ فِىٓ أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا۟ أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا۟ قَالُوا۟ لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿١٤٩﴾ (سورہ اعراف آیت ۱۴۹)

قَالَ رَبِّ ٱغْفِرْ لِى وَلِأَخِى وَأَدْخِلْنَا فِى رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ﴿١٥١﴾ (سورہ اعراف آیت ۱۵۱)

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ ٱلْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ (سورہ اعراف آیت ۱۵۲)

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ (سورہ طٰہٰ، آیت ۴۰)

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِى وَلَا بِرَأْسِىٓ ۖ ....(سورہ طٰہٰ، آیت/ ۹۴)

..... يَٰقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِۦ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ ٱلرَّحْمَٰنُ فَٱتَّبِعُونِى وَأَطِيعُوٓا۟ أَمْرِى ﴿٩٠﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت، ۹۰)

.........إِنِّى خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِى ﴿٩٤﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت، ۹۴)

.... فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنۢ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِىُّ ﴿٨٥﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت، ۸۵)

......أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ ٱلْعَهْدُ .... (سورہ طٰہٰ، آیت ۸۶)

.... مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوٓاْ ﴿٩٢﴾ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِى ﴿٩٣﴾ (سورہ طہٰ، آیت ۹۲-۹۳)

.....فَعَلْتُهَآ إِذًا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿٢٠﴾ (سورہ شعراء، آیت ۲۰)

.....أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ﴿١٨﴾ (سورہ شعراء، آیت ۱۸)

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ ٱلَّتِى فَعَلْتَ وَأَنتَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿١٩﴾ (سورہ شعراء، آیت، ۱۹)

قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿٢٠﴾ (سورہ شعراء، آیت، ۲۰)

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ﴿٢٢﴾ (سورہ شعراء، آیت ۲۲)

قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ ۖ إِنَّهُۥ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ (سورہ قصص، آیت ۱۵)

رَبِّ إِنِّى ظَلَمْتُ نَفْسِى فَٱغْفِرْ لِى فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ (سورہ قصص، آیت ۱۶)

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُۥ وَٱسْتَوَىٰٓ ءَاتَيْنَٰهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٤﴾ (سورہ قصص، آیت ۱۴)

وَدَخَلَ ٱلْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِۦ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِۦ ۖ فَٱسْتَغَٰثَهُ ٱلَّذِى مِن شِيعَتِهِۦ عَلَى ٱلَّذِى مِنْ عَدُوِّهِۦ فَوَكَزَهُۥ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ ۖ إِنَّهُۥ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ (سورہ قصص، آیت ۱۵)

قَالَ رَبِّ إِنِّى ظَلَمْتُ نَفْسِى فَٱغْفِرْ لِى فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ (سورہ قصص، آیت ۱۶)

قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿١٧﴾ (سورہ قصص، آیت ۱۷)

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى ٱلْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىِۦ نِسَآءَهُمْ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ مِنَ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿٤﴾ (سورہ قصص، آیت ۴)

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا ٱلْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّ ٱلْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَٱخْرُجْ إِنِّى لَكَ مِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ ﴿٢٠﴾ (سورہ قصص، آیت ۲۰)

.........فَٱغْفِرْ لِى فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ (سورہ قصص، آیت ۱۶)

ءَاتَيۡنَٰهُ حُكۡمٗا وَعِلۡمٗاۚ وَكَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿١٤﴾(سورہ قصص، آیت۱۴)

رَبِّ بِمَآ أَنۡعَمۡتَ عَلَيَّ فَلَنۡ أَكُونَ ظَهِيرٗا لِّلۡمُجۡرِمِينَ ﴿١٧﴾ (سورہ قصص، آیت۱۷)

أَءِذَا ضَلَلۡنَا فِي ٱلۡأَرۡضِ أَءِنَّا لَفِي خَلۡقٖ جَدِيدِۭۚ .... (سورہ سجدہ آیت۱۰)

تفسیر آیات

۱۔ قبطی کا قتل

حضرت موسیٰ کی زندگی کا واقعہ ملتا ہے کہ وہ شہر میں داخل ہوئے انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا ان میں سے ایک کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا دوسرے کا فرعون سے، جس کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اس نے موسیٰ سے مدد طلب کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی کو ایک گھونسہ مارااور وہ وہیں مر گیا، اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس عمل کو شیطانی عمل کہہ کر یاد کیا

یہ ایک شیطانی کام ہے(جو مجھ سے سرزد ہوا ہے) بیشک شیطان کھلم کھلا گمراہ کرنے والا، اور بشریت کا دشمن ہے۔

۲۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا شمار ظالمین میں کیا(یعنی نفس پر ظلم کرنے ولا) اور اللہ سے یہ کہہ کر استغفار کیا۔

"رَبِّ إِنِّي ظَلَمۡتُ نَفۡسِي فَٱغۡفِرۡ لِي فَغَفَرَ لَهُۥٓۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلۡغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦﴾" [۹۶]

۳۔ جب فرعون نے اپنے دربار میں اس شخص کے قتل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ذکر کیا(یعنی گویا طعنہ دیا اور یاد دلایا) اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عمل کو اس طرح توصیف کیا:

"فَعَلۡتُهَآ إِذٗا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿٢٠﴾" [۹۷]

مذکورہ تینوں جملے جو کو د حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان سے جاری کئے ہیں کس طرح عصمت انبیاء کے عقیدہ سے ہماہنگ ہوسکتے ہیں؟

جواب: قرآن مجید نے قبطی کے قتل کے قصہ کو دو سوروں میں بیان کیا ہے اور وضاحت کے لئے دونوں سوروں کی آیات کی نشاندہی ضروری ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُۥ وَٱسۡتَوَىٰٓ ءَاتَيۡنَٰهُ حُكۡمٗا وَعِلۡمٗاۚ وَكَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ [۹۸] ﴿١٤﴾

۹۶۔ سورہ قصص، آیت۱۶

۹۷۔ سورہ شعراء، آیت،۲۰

۹۸۔ سورہ قصص، آیت ۱۴

وَدَخَلَ ٱلْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِۦ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِۦ ۖ فَٱسْتَغَٰثَهُ ٱلَّذِى مِن شِيعَتِهِۦ عَلَى ٱلَّذِى مِنْ عَدُوِّهِۦ فَوَكَزَهُۥ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ ۖ إِنَّهُۥ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۔[۹۹]

قَالَ رَبِّ إِنِّى ظَلَمْتُ نَفْسِى فَٱغْفِرْ لِى فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿۱۶﴾[۱۰۰]

قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿۱۷﴾[۱۰۱]

یہی واقعہ اختصار کے ساتھ سورہ شعراء میں بھی بیان ہوا ہے

.....أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ﴿۱۸﴾[۱۰۲]

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ ٱلَّتِى فَعَلْتَ وَأَنتَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿۱۹﴾[۱۰۳]

قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿۲۰﴾[۱۰۴]

اب اس واقعہ کی نوعیت کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔اس میں کوئی شک نہیں کہ فرعونیوں نے دربار فرعون کے ایک آدمی کے علاوہ (غالباً حزقیل مراد ہیں) تمام بنی اسرائیل کو ظلم وستم کا نشانہ بنا کر پسماندہ اور کمزور کیا، ان کی اولاد کے سر قلم کئے اور عورتوں کو کنیز بنایا جیسا کہ یہ دو آیتیں بیان کر رہی ہیں:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى ٱلْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىِۦ نِسَآءَهُمْ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ مِنَ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿۴﴾[۱۰۵]

۹۹۔ سورہ قصص، آیت ۱۵

۱۰۰۔ سورہ قصص، آیت ۱۶

۱۰۱۔ سورہ قصص، آیت ۱۷

۱۰۲۔ سورہ شعراء، آیت ۱۸

۱۰۳۔ سورہ شعراء، آیت ۱۹

۱۰۴۔ سورہ شعراء، آیت ۲۰

۱۰۵۔ سورہ قصص، آیت ۴

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِيَ إِسْرَاءِيلَ ﴿٢٢﴾ [۱۰۶]

اس بنا پر ایک قبطی کا قتل جس کا تعلق ان فرعونیوں سے تھا جنھوں نے ہزاروں بے گناہ بچوں کے سر کاٹے ور عورتوں کو کنیز بنایا، عقل وخرد کی عدالت میں ایک چھوٹا سا جرم بھی نہیں ہے، وہ بھی وہ قبطی جو ایک اسرائیلی کو قتل کرنا چاہتا تھا (مورخین کا کہنا ہے کہ وہ قبطی خباز تھا یعنی اس کا پیشہ روٹی پکانے کا تھا، اس نے ایندھن خریدا اور اس اسرائیلی سے کہا کہ تم میرا یہ بوجھ میرے مرکز تک پہونچا دو، اس نے منع کیا، قبطی نے اصرار کیا یہاں تک کہ آپ میں مار پیٹ کی نوبت آگئی اسرائیلی نے موسیٰ سے مدد چاہی اور پھر موسیٰ نے ایسا کیا" بحار الانوار ج۱۳ ص۵۷")

اگر موسیٰ علیہ السلام نے اسے قتل نہ کیا ہوتا تو وہ اس اسرائیلی کو بھی ہزاروں بے گناہوں کی طرح قتل کر دیتا اور چونکہ وہ فرعون کا آدمی تھا اس لئے اس سے کسی طرح کی باز پرسی بھی نہ ہوتی بلکہ ممکن تھا کہ اس کی تعریف ہوتی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ کیا ہیں اور ان کا مطلب کیا ہے۔

یہ جملہ: "هَـٰذَا مِنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَـٰنِ " اس جملہ میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

الف: لفظ ھذا سے اشارہ خود طرفین کے نزاع کی طرف ہے۔ گویا یہ اشارہ اس فرعونی کی سینہ سپری اور ایک اسرائیلی کمزور آدمی پر مسلط ہونے کی طرف ہے جس نے خود اپنے قتل کے اسباب فراہم کئے اگر اس نے اس اسرائیلی کو نہ ستایا ہوتا تو ہرگز قتل نہ کیا جاتا۔[۱۰۷]

اس تفسیر کی بنا پر آیت میں سوال باقی نہیں رہتا۔

ب: لفظ "ھذا" سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہی عمل کی طرف اشارہ کیا کہ میرا ہی عمل شیطانی عمل ہے، اور یہ اسلئے کہا کہ فرعونی کا قتل اور وہ بھی ایسے حالات میں ایک بے موقع اور عجلت پر مبنی عمل تھا۔ اگر موسیٰ علیہ السلام نے تحمل اور صبر وبردباری سے کام لیا ہوتا یہ فرعونی بھی کچھ مدت کے بعد تمام فرعونیوں کے ساتھ دریا میں غرق ہو جاتا، اور اس قتل کی بنا پر موسیٰ کو دربدری کی زندگی میں مبتلا نہ ہونا پڑتا۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی جب پتہ چل گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا ہے تو موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ ہو گیا۔

اگر موسیٰ علیہ السلام کو بیت فرعون میں رہنے والے ایک شخص نے فرعونیوں کے منصوبہ کی خبر نہ دی ہوتی تو موسیٰ کو گرفتار کر لیا جاتا اور قتل کر دیا جاتا جیسا کہ آیت ہے "وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا ٱلْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَـٰمُوسَىٰٓ إِنَّ ٱلْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَٱخْرُجْ إِنِّى لَكَ مِنَ ٱلنَّـٰصِحِينَ ﴿٢٠﴾ "[۱۰۸]

۱۰۶۔ سورہ شعراء، آیت ۲۲

۱۰۷۔ بحار الانوار ج۱۳ ص۵۷

۱۰۸۔ سورہ قصص، آیت ۲۰

اس عجولانہ اقدام کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے اشارہ کیاہے کہ یہ اقدام شیطانی ہے جیس اکہ روایت ہے:"العجلۃ من الشیطان" کسی بھی کام میں جلدی کرناشیطانی عمل ہے۔

اسی سے دوسرے جملہ کامفہوم بھی روشن ہو جاتاہے:"قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي "

۲۔" رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي "خدایا! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا

لغت عرب میں ظلم کامفہوم یہ ہے کہ کسی شے کو اس کی مناسبت سے ہٹ کر دوسری جگہ پر قرار دیا جائے، لہٰذا ظالم بھی وہ ہے جو کسی کام کو بے موقع انجام دے، اس میں کوئی شک نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل عجلت پر مبنی تھا جو اپنے وقت کی مناسبت سے ہٹ کر تھا، جس کو انجام دے کر موسیٰ کو بے وطنی اور دربدری کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ میں نے اللہ پر یا کسی اور پر ظلم کیا بلکہ کہا کہ میں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ میں نے اللہ پر یا کسی اور پر ظلم کیا بلکہ کہا کہ میں خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کا عمل بھی حضرت آدم علیہ السلام کے عمل کی طرح صرف ایک ترک اولیٰ تھا اور بس، اور دونوں کو ایس ترک اولیٰ کا وضعی اثر (دربدری) برداشت کرناپرا۔

آدم علیہ السلام کو جنت کے عیش و آرام سے محروم ہوناپرا اور موسیٰ علیہ السلام کو غریب الوطن ہو کر بھیڑیں تک چرانی پڑیں، اور دونوں نے ایک ہی الفاظ زبان پر جاری کئے:

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ظَلَمْتُ نَفْسِي

آدم و حوا علیہما السلام نے کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا

یعنی دونوں نے خود اپنے ہی نفس کو مظلوم قرار دیا

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نفس پر ظلم کا اعتراف کرنے کے بعد اللہ سے استغفار کیا:

فَٱغْفِرْ لِى فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦﴾

خدایا! مجھے بخش دے۔ اللہ نے بھی بخش دیا، بیشک اللہ بہت ہی بخشنے والا اور رحیم ہے۔

اسی طرح آدم و حوا علیہما السلام نے بھی اپنے نفس پر ظلم کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ کی بارگاہ میں استغفار کیا

"وَإِن لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَسِرِينَ " خدایا! اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

طلب مغفرت کی تفسیر یہ ہے کہ انبیاء اور خاصان خدا کی شان کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے کاموں سے بھی پرہیز کریں چاہے گناہ اور معصیت کا درجہ نہ رکھتے ہوں۔

اور مغفرت کی درخواست اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ انبیاء سے کوئی گناہ یا دعل حرام سرزد ہوا ہے، لیکن موسیٰ کے حالات کی مناسبت سے بہتر یہ تھا کہ ایسا عمل ان سے صادر نہ ہو، اسی لئے جب انہوں نے اس عمل (قتل) کا موازنہ اپنے حالات سے کیا تو اسے اپنے حالات سے ہماہنگ نہ پایا اس لئے اللہ سے مغفرت کی درخواست کی۔ گویا ایک اعتبار سے موسیٰ کے اس عمل (قتل) کو گناہ نسبی کہا جاسکتا ہے اور بزرگوں کا یہ مقولہ مشہور ہے:

"حسنات الابرار سیئات المقربین"

نیک افراد کی نیکیاں، درگاہ خدا کے مقربین کے لئے گناہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

اس لئے کہ مقرب افراد سے امیدیں کچھ زیادہ ہوتی ہیں ممکن ہے کہ ایک عمل عام افراد کے لئے باعث تحسین ہو اور وہی عمل خواص کے لئے نازیبا ہو۔

اس کے علاوہ ایک احتمال یہ بھی کہ طلب مغفرت سے مراد، اس عمل (قتل) کے وضعی اثر سے نجات کا مطالبہ ہو اور وضعی آثار سے نجات دینا صرف اللہ ہی کا کام ہے

اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ عمل ان حالات میں ردعمل کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اسی لئے سورہ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ نقل کرنے کے بعد ان کی نجات کا تذکرہ ہے:

"وَقَتَلۡتَ نَفۡسًا فَنَجَّيۡنَكَ مِنَ ٱلۡغَمِّ " اے موسیٰ! تم نے ایک انسان کو قتل کیا تو پھر ہم نے تمہیں غم سے نجات دی۔

یہ احتمال حضرت آدم علیہ السلام کے طلب مغفرت کے بارے میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ آخری جملہ جو موسیٰ کے واقعہ میں رہ گیا ہے وہ یہ ہے:

"قَالَ فَعَلۡتُهَا إِذًا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ "اس جملہ کی تفسیر میں دو نکتہ بیان کرنا ضروری ہے:

الف: خداوند عالم نے اس قتل کے واقعہ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی توصیف اس طرح کی ہے:

"ءَاتَيۡنَٰهُ حُكۡمٗا وَعِلۡمٗاۚ وَكَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿١٤﴾ "ہم نے حکمت اور علم موسیٰ کو عطا کیا اور نیک لوگوں کو ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں۔

ب: موسیٰ علیہ السلام نے اسے قتل کر کے اگرچہ ایک اعتبار سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے اور کہا کہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا لہٰذا مجھے بخش دے، لیکن دوسرے اعتبار سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس عمل کو ایک ظالم کا مقابلہ اور ایک مظلوم کی حمات کا درجہ دیتے ہوئے اس عملک ی تعریف کی، اگرچہ عمل موقع اور محل کے لحاظ سے مناسب نہ تھا چنانچہ کہا:

"رَبِّ بِمَآ أَنۡعَمۡتَ عَلَيَّ فَلَنۡ أَكُونَ ظَهِيرٗا لِّلۡمُجۡرِمِينَ ﴿١٧﴾ "[۱۰۹]

یعنی جس طرح اب تک ظالم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت کرتا تھا آئندہ بھی ایسے ہی کرتا رہوں گا۔

اسجملہ کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے پوری طرح سے صحیح تھا اگرشہ موقع و محل کی نزاکت کے خلاف تھا، ان دو نکات کی وضاحت کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں ضال کا مفہوم کیا ہے:

اس واقعہ کے آغاز مین جو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوصاف و کمالات بیان کئے ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر گز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ موسیٰ راہ حق سے گمراہ تھے، بلکہ کبھی کبھی لفظ ضال اور ضل نسیان و غفلت اور انجام کار سے بے خبری کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مخصوص قرائن کے ساتھ

جیسا کہ اللہ نے قرآن میں حکم دیا ہے کہ جب تم ایک دوسرے کو قرض دو تو ایک کاتب اسے لکھ لیا کرے اور دو گواہ اسکی تصدیق کا کام انجام دیں، پھر گواہوں کی وجہ بیان کی ہے:

"أَن تَضِلَّ إِحۡدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحۡدَىٰهُمَا ٱلۡأُخۡرَىٰۚ "

: کہ اگر ان دونوں میں سے ایک فراموش کردے تو دوسرا یاد آوری کردے۔

اس آیت میں لفظ تضل، نسیان و غفلت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

کبھی کبھی یہ لفظ قرینہ کے ساتھ غائب اور پوشیدہ ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اسی معنی کی بناپر گمشدہ چیز کو ضالہ کہا جاتا ہے۔

آیت: "أَءِذَا ضَلَلۡنَا فِي ٱلۡأَرۡضِ أَءِنَّا لَفِي خَلۡقٖ جَدِيدِۭ "

۔اگر ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا پھر بھی ہمیں دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

۱۰۹۔ سورہ قصص، آیت ۱۷

ان آیات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مراد لفظ ضال سے دربار فرعون میں عذر خواہی کرتے ہوئے یہ تھی کہ میں گھونسہ مارتے وقت اس کے انجام سے بے خبر ہو گیا تھا اور مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ یہ مر جائے گا ورنہ میں ہر گز اسے گھونسہ نہ مارتا۔ یہ گویا میری مختصر سے غفلت کا نتیجہ ہو گیا، اور میں انجام کار سے بے خبر ہو گیا، گویا اس کام کا انجام میری نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا۔

(دونوں معانی جو ذکر کئے گئے ہیں ان کا مراد لینا لفظ ضال سے ممکن ہے)

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام سے اختلاف:

مخالفین عصمت کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گذشتہ دلیل کے علاوہ ایک دلیل اور ہے جس کے ذریعہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کا انکار یا اس میں تشکیک کی ہے، اور اس طرح گویا تمام انبیاء کی عصمت کو زیر سوال قرار دیا ہے، اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تو ان کے نزدیک محض بطور مثال بیان ہوا ہے، ورنہ وہ جملہ انبیاء کی عصمت کو زیر سوال قرار دیتے ہیں۔

اور وہ دلیل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام توریت اور اپنی شریعت کے احکام و قوانین اخذ کرنے کے لئے میقات کے سفر پر مامور ہوئے اور انہوں نے اپنی عدم موجودگی میں ہارون کو اپنا جانشین قرار دے دیا، لیکن اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس مدت میں سونے کے بچھڑے کی پرستش شروع کر ڈالی، جب جناب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور اس واقعہ سے آگاہ ہوئے تو اتنا غضبناک ہوئے کہ توریت کی تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی ہارون کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا جیسا کہ قرآن میں ہے:

"وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوْمِهِۦ غَضْبَٰنَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِى مِنۢ بَعْدِىٓ ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى ٱلْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُۥٓ إِلَيْهِ ۚ ...."[۱۱۰]

سورہ طٰہٰ کی آیات کے مطابق سر اور داڑھی دونوں پکڑ کر موسیٰ نے ہارون کو اپنی طرف کھینچا

جیسا کہ قرآن جناب ہارون کی زبان سے نقل کر رہا ہے: "يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِى وَلَا بِرَأْسِىٓ "

ان آیات کے مدنظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ باتیں یعنی توریت کا پھینکنا اور اپنے حقیقی بڑے بھائی کو گھسیٹنا، انبیاء کی شان کے مطابق ہے اور کیا اس واقعہ سے انبیاء کی عصمت زیر سوال قرار نہیں پاتی۔ کیا اس قسم کی تند مزاجی شان عصمت کے خلاف نہیں ہے؟

جواب: مذکورہ دلیل مخالفین کا جواب دینے سے پہلے ضرورت ہے کہ چند نکات کی وضاحت کی جائے؛

۱۔ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ کی وعدہ گاہ (میقات) پر جا رہے تھے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنا جانشین بنایا اور یہ تاکید کی:

۱۱۰۔ سورہ اعراف آیت ۱۵۰

"ٱخۡلُفۡنِي فِي قَوۡمِي وَأَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِيلَ ٱلۡمُفۡسِدِينَ "[۱۱۱]

۲۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاکید پر مکمل طور پر عمل کیا کہ جب ان کی قوم نے گوسالہ پرستی کرنا چاہی تو حضرت ہارون نے قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"يَٰقَوۡمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِۦۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ ٱلرَّحۡمَٰنُ فَٱتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوٓاْ أَمۡرِي ﴿٩٠﴾ "[۱۱۲]

اگر چہ آیت کے لہجہ اور لحن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون نے قوم پر اس مسئلہ میں بہت سخت رد عمل ظاہر نہیں کیا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح ان کی قوم میں تفرقہ پیدا ہو جاتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں یہ تفرقہ غلط ثابت ہوتا، اس لئے جتنی حالات نے اجازت دی اتنا ہی حضرت ہارون نے اس مسئلہ میں سختی کی۔

چنانچہ تفرقہ کے کوف کا ذکر خود حضرت ہارون کے الفاظ میں پایا جاتا ہے:

"إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقۡتَ بَيۡنَ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِي ﴿٩٤﴾ "[۱۱۳]

۳۔ موسیٰ ابھی میقات ہی پر تھے کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی سے وحی الٰہی کے ذریعہ آگاہ ہو گئے اور اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

"فَإِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۢ بَعۡدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ "[۱۱۴]

۴۔ جناب موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سن کر بہت ہی غمگین ہوئے، اور انہیں اپنی سالہا سال کی محنت برباد ہوتی دکھائی دی، لہٰذا جب قوم کے درمیان واپس آئے تو غصہ کی آگ ان کے دل میں بھڑک اٹھی۔

اس لئے انہوں نے قوم کو خطاب کرت ہوئے کہا:

"بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُونِي مِنۢ بَعۡدِيٓۖ أَعَجِلۡتُمۡ أَمۡرَ رَبِّكُمۡۖ ..."[۱۱۵]

سورہ طہ میں اس واقعہ کو دوسری طرح بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو مخاطب کر کے کہا:

۱۱۱۔ سورہ اعراف آیت ۱۴۲

۱۱۲۔ سورہ طہٰ، آیت، ۹۰

۱۱۳۔ سورہ طہٰ، آیت، ۹۴

۱۱۴۔ سورہ طہٰ، آیت، ۸۵

۱۱۵۔ سورہ اعراف آیت آیت ۱۵۰

"أَلَم يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًاۚ أَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡعَهۡدُ ...."[۱۱۶]

۵۔ موسیٰ نے ایسے حالات میں اپنے غصہ کا اظہار دو طرح سے کیا:

الف: توریت کی تختیوں کو دور پھینک دیا

ب: موسیٰ نے گمان کیا کہ ہارون نے قوم کے اس عمل پر کوئی اہم رد عمل ظاہر نہیں کا ی لہٰذا موسیٰ نے ہارون سے کہا:

"مَا مَنَعَكَ إِذۡ رَأَيۡتَهُمۡ ضَلُّوٓاْ ﴿۹۲﴾ أَلَّا تَتَّبِعَنِۖ أَفَعَصَيۡتَ أَمۡرِى ﴿۹۳﴾"[۱۱۷]

اب دیکھنا یہ ہے کہ موسیٰ نے ایک اولوالعزم پیغمبر ہوتے ہوئے ایسا کیوں کیا اور یہ سخت طریقہ کیوں اپنایا جو بظاہر شان نبوت و عصمت کے خلاف ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ عمل (گوسالہ پرستی) بے حد برا عمل تھا اور اس کے مقابلہ میں جناب موسیٰ علیہ السلام کو ہرگز نرمی کا برتاؤ نہیں کرنا تھا، لہٰذا موسیٰ علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ یہ واقعہ کتنا برا پیش آیا ہے؟

اور اگر اس حادثہ کے بارے میں سخت ترین رویہ اختیار نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ اتنی آسانی سے قوم اس عمل کو ترک نہ کرے، یا اگر ترک بھی کر دے تو اس پرستش کے آثار ذہن میں باقی رہ جائیں، اسلئے جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں واپس آئے اور یہ عالم دیکھا تو اس سلسلے میں سب سے پہلے اس شخص کی باز پرس کی جس کے سپرد پوری قوم کو کر کے گئے تھے، یعنی جناب ہارون علیہ السلام لیکن جب جناب ہارون علیہ السلام کا اس سانحہ کے بہ نسبت بے خطا ہونا ان کی نظروں میں ثابت ہو گیا تو پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس سانحہ کے دیگر اسباب و عوامل کی تحقیق شروع کی اور ان اسباب کے خاتمہ کی فکر میں مشغول ہو گئے لیکن سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے خود ہارون کا گریبان پکڑا جو اس مدت میں قوم کے سرپرست تھے، اگر ہارون کے بجائے کسی اور سے باز پرس کی جاتی اور ہارون کو چھوڑ دیا جاتا تو موسیٰ کا یہ عمل صحیح نہ ہوتا۔

لیکن توریت کی تختیوں کا دور پھینکنا اور ہارون کے سر اور داڑھی کے بال اپنی طرف کھینچنا، یہ اس لئے تھا کہ موسیٰ کو ہارون کے بارے میں یہ گمان تھا کہ ہارون اس واقعہ کے بہ نسبت کوئی سخت رد عمل قوم کے مقابلے میں ظاہر نہیں کیا، اس کے علاوہ یہ کہ موسیٰ کے اس غصہ میں خود قوم کی تربیت کا سامان بھی فراہم تھا کہ اس طرح قوم کو اپنی بد عملی کا احساس پیدا ہو اور اس سے پہلے قوم کو موسیٰ کا یہ رد عمل دیکھ کر اپنی بد عملی کی شدت کا علم پیدا ہو، اور نتیجہ میں قوم گوسالہ پرستی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے توریت کی جن تختیوں کے لئے چالیس دن میقات پر گزارے تھے انہیں قوم کے سامنے دور پھینک دیا اور اپنے بھائی ہارون سے اس طرح باز پرش کرنے لگے تاکہ یہ منظر قوم اپنی نگاہوں سے دیکھے تو سمجھے کہ اس نے کتنا برا گناہ انجام دی اہے، اس طرح

۱۱۶سورہ طٰہٰ، آیت ۸۶

۱۱۷۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۹۲-۹۳

قوم کے فکر و عمل میں تبدیلی آئے اور اس کی روح میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے، چنانچہ جب ہارون کی بے گناہی موسیٰ کی نظروں میں ثابت ہو گئی اور ہارون نے اپنے رد عمل کی خبر دیتے ہوئے موسیٰ سے کہا:

"إِنَّ ٱلۡقَوۡمَ ٱسۡتَضۡعَفُونِي وَكَادُواْ يَقۡتُلُونَنِي فَلَا تُشۡمِتۡ بِيَ ٱلۡأَعۡدَآءَ وَلَا تَجۡعَلۡنِي مَعَ ٱلۡقَوۡمِ ٱلظَّٰلِمِينَ "[118]

تو برجستہ موسیٰ کا نظریہ ہارون کے بہ نسبت تبدیل ہو گیا اور ان کے دل میں ہارون کی محبت جوش میں آگئی، اور فوراً موسیٰ نے اللہ کی بارگاہ میں دست دعا بلند کر دیا اور کہا:

"قَالَ رَبِّ ٱغۡفِرۡ لِي وَلِأَخِي وَأَدۡخِلۡنَا فِي رَحۡمَتِكَۖ وَأَنتَ أَرۡحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ﴿١٥١﴾ "[119]

یہ طلب مغفرت اپنے اور اپنے بھائی کے لئے کسی گناہ کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ شان انبیاء کا تقاضا اور ان کی ذمہ داریوں کی عظمت کا ثبوت تھا، انہیں ذمہ داریوں کی تعمیل کی راہ میں انبیاء ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں صاحب تقصیر جاتے ہوئے اسغفار اور توبہ میں مصروف رہتے تھے

،اور ان کے استغفار کسی گناہ و معصیت کی بنا پر نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ یوں کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا کہ ہمارے گناہوں کا معیار انبیاء کے گناہوں کے معیار سے مختلف ہے، اور اسی بنیاد پر دونوں کے یہاں استغفار کا فلسفہ بھی تبدیل ہو جائے گا، ہمارے یہاں استغفار و توبہ گناہوں پر مبنی ہوتے ہیں مگر انبیاء کے یہاں ایسا نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اسی غضب کے عالم میں اپنی قوم کے واقعی گناہکاروں کی طرف رخ کیا اور کہا:

"إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ ٱلۡعِجۡلَ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَذِلَّةٞ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَاۚ وَكَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُفۡتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ "[120]

۱۱۸۔ سورہ اعراف آیت ۱۵۰

۱۱۹۔ سورہ اعراف ت ۱۵۱

۱۲۰۔ سورہ اعراف آیت ۱۵۲

۶۔ قرآن اور عصمت حضرت سلیمان علیہ السلام

آیات موضوع

۱۱ آیات

تفسیر آیات

قصص الانبیاء میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضرت سلیمان عصر کے وقت اپنے اصطبل کے گھوڑوں کا جائزہ لے رہے تھے اور اس کام میں اتنا محو ہو گئے کہ سورج چھپ گیا اور ان کی نماز عصر قضا ہو گئی انہوں نے فرشتوں سے سورج کو پلٹانے کی درخواست کی چنانچہ سورج پلٹا اور آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی۔

اور چونکہ خود گھوڑوں کا نظارہ یا گھوڑوں کے مسابقہ کا نظارہ نماز کے فراموش ہونے کا سبب بنا تھا اس لئے حضرت سلیمان نے تمام گھوڑوں کے سر اور پنڈلیاں تلوار سے کاٹ دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس داستان کا ذکر سورہ ص کی آیت ۳۱ اور ۳۴ میں پایا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ آیات کی یہ تفسیر صحیح ہے ؟ اور اگر صحیح ہے تو کیا ایک نبی کی شان کے مطابق ہے کہ وہ دنیاوی سرگرمی کی بنا پر نماز قضا کرے اور پھر گھوڑوں کے سر اور پنڈلیاں بھی قلم کر دے ؟ کیا یہ مطلب نبی کی عصمت کے خلاف نہیں ؟

جواب: اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں اس واقعہ سے متعلق تمام آیات کی تحقیق کرنا ہوگی اور پھر واقعہ کا تجزیہ و تحلیل کرنا ہو گا

آیات حسب ذیل ہیں:

ووھبنا لداوٗد

اذ عرض علیہ

فقال انی

ردوھا علی

ان آیات کی تفسیر سے قبل چند نکات کا ذکر کرنا جروری ہے:

۱۔ صافنات صافنہ کی جمع ہے یعنی وہ اصیل گھوڑے جو تین پیروں پر زور دے کر کھڑے ہوتے ہیں اور چوتھے پیر و کو کبھی اوپر اٹھا لیتے ہیں اور کبھی اس پیر کے سم کی نوک کو زمین پر رکھ کر یہ اظہار کرتے ہیں کہ گویا دوڑنے کے لئے آمادہ ہیں۔

۲۔جیاد،جواد کی جمع ہے جس کامادہ جود ہے جس کے معنی سخاوت اور نچھار کرنے کے ہیں۔

اس مراد تیزرفتار گھوڑے ہیں جو اپنی تیز رفتاری کے ذریعہ گویا اپنے مالک پر جان نثار کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

۳۔خیر:لغت عرب میں خر کے صرف ایک معنی ہیں یعنی شر کامقابل،لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ مال کے معنی میں بھی آیا ہے جیسے:

"ان ترک خیرا" اگر مرنے والا ترکہ میں مال چھوڑے۔

اور موجودہ آیت میں یہ لفظ،ماقبل کی آیت کے قرینہ اور دلالت کی بناپر (یعنی الصافنات الجیاد) تیزرفتار گھوڑوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس لئے کہ ایسے گھوڑے زندگی کے لئے سراسر فائدہ اور نفعی کا باعث ہوتے ہیں گویاانسان کے لئے سبب خیر ہوتے ہیں۔

چنانچہ مفسرین نے یہاں پر پیغمبر اسلام کا یہ قول نقل کیاہے:" خیر اور فائدہ تندرفتار گھوڑوں کی پیشانیوں سے وابستہ ہے"

۴۔حب،بغض کی ضد ہے اور احببتہ کے معنی ہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔

حب الخیر، آیت میں احببت کے مفعول محذوف کا بدل اور جانشین ہے،جملہ کی تقدیر اور ظاہری شکل اس طرح ہے:احببت الخیل حب الخیر،اس جملہ کے معنی ہیں کہ تندرفتار گھوڑوں سے میری محبت امر خیر سے محبت کے مانند ہے۔

اس لئے کہ یہ گھوڑے بشریت اور دین کے لئے باعث زندگی اور بقا کی ضمانت ہیں کہ ان گھوڑوں کے ذریعہ دشمنان توحید سے جہاد کیا جاسکتا ہے اور شرک کا تختہ پلٹا جاسکتا ہے۔

ایک دوسری تحلیل و تفسیر بھی اس جملہ کی ممکن ہے جو آیت کے بعد کے الفاظ سے مناسبت رکھتی ہے(یعنی عن ذکر ربی)اور وہ تفسیر یہ ہے کہ خود لفظ حب الخیر احببت کا مفعول قرار دیا جائے کہ مفعول کا بدل اور جانشین اور خیر سے مراد جیا کہ کہا گیا گھوڑے ہیں۔اور جملہ کی پوری شکل یہ ہے:

احببت الخیر حبا عن ذکر اللہ

یعنی ان گھوڑوں سے میں محبت کرتا ہوں ایسی محبت جس کا سرچشمہ یاد خدا ہے

یاد خدا سے مراد حکم خدا کی یاد ہے اور حکم خدا سے مراد یہاں پر حکم جہاد ہے کہ ہمیشہ دشمن توحید سے جہاد کے لئے آمادہ رہو۔اور آیت میں ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ نبی خدا دنیاوی مال و منال اور اپنی طاقت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں، گویا اپنی وجوی اور نظامی طاقت پر فخر کرتے ہیں بلکہ یہ محبت بھی اگر ہے تو صرف یاد خدا کی بناپر ہے کہ اگر اللہ کا حکم جہاد نہ ہوتا تو جہاد کے ان تیزرفتار گھوڑوں سے محبت بھی نہ ہوتی۔

۶۔حتیٰ توارت بالحجاب: یہاں تک کہ وہ گھوڑے دوڑتے دوڑتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے

آیت میں توارت کا فاعل وہی گھوڑے ہیں (الصافنات الجیاد)۔

۷۔ ردوھا۔ جب وہ گھوڑے دوڑتے دوڑتے سلیمان کی نظروں سے او جھل ہو گئے تو سلیمان ن گھوڑوں کے ذمہ دار لوگوں کو حکم دیا کہ دوبارہ گھوڑوں کو واپس لاؤ۔ کیوں واپس لاؤ اس کا جواب بعد کی آیت میں آرہا ہے۔

۸۔ فطفق مسحا بالسوق والاعناق۔ جب مجاہدین کے گھوڑے اپنے سواروں کے ساتھ واپس آئے تو سلیامن نے ان گھوڑوں کے مربی افراد کی قدر دانی کے لئے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردوں کو ملنا شروع کر دیا۔ گویا سلیمان ان گھوڑوں کے مربی افراد کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تھے جو گھوڑوں پر سوار ہو کر سلیمان کی فوج میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے تھے، اور ان گھوڑوں کی تربیت کر رہے تھے۔

یہاں تک آیات کے اہم الفاظ اور جملوں سے آشنائی حاصل ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ سلیمان ایک بڑی شکوہ وعظمت والے بادشاہ تھے جن کی حکومت اور قدرت کو اللہ نے قرآن میں بڑی شان وشوکت سے بیان کیا ہے۔

ایک دن عصر کے وقت وہ اپنے اصطبل کے گھوڑوں کی دوڑ کا نظارہ کرنے لگے، گھوڑ سوار سپاہی سلیمان کے سامنے سے دوڑتے ہوئے گذر رہے تھے، اس وقت سلیمان نے اپنے پاس کھڑے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان گھوڑوں سے میری محبت درحقیقت خیر اور نیکی سے محبت ہے اور میری اس محبت کا راز بھی یاد خدا اور خدا کے حکم جہاد کی یاد ہے۔

گویا میری اس محبت میں خدائی رنگ پایا جاتا ہے، تھوڑی دیر بعد یہ گھوڑے ان کی ں ظروں سے او جھل ہو گئے تو دوبارہ پلٹانے کا حکم دیا، گھوڑے واپس آئے تو آپ نے ان کے سواروں کا شکریہ اور تشویق کا کام اس طرح انجام دیا کہ گھوڑوں کی پیشانی، گردن اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرا، اور اس طرح ایک بادشاہ کا اپنی فوج کا نظارہ تمام ہوا۔

گویا یہ آیت دنیا کے ایک بہت بڑے بادشاہ کی فوجی اور نظامی طاقت کا مظاہرہ کر رہی ہیں جس کی حکومت پوری طرح خدائی حکومت تھی اور عدل وانصاف پر مشتمل۔

مذکورہ آیات کی یہی تفسیر کسی حد تک سید مرتضیٰ تنزیۃ الانبیاء میں علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں بھی بیان فرمائی ہے۔

اور آیات کے ظاہری الفاظ ومعانی سے بھی پوری طرح مطابقت اور مناسبت رکھتی ہے، جس میں آیات کے معانی میں کسی بھی قسم کا تصرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان اس تفسیر کی تحقیق کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ سلیمان عصر کے وقت گھوڑوں کے نظارہ میں ایسا محو ہو گئے کہ انہیں نماز کے وقت کے ختم ہونے اور سورج کے غروب ہونے کا بھی احساس نہ ہوا اور نماز عصر قضا ہو گئی پھر آپ نے فرشتوں کو حکم دیا سورج کو پلٹایا اور نماز عصر پڑھی۔

یہاں پر پہونچ کر ان مفسرین میں بھی دو گروہ ہو جاتے ہیں:

بعض کا کہنا ہے کہ چونکہ گھوڑوں کے نظارہ نے انہیں نماز سے غافل کر دیا اس لئے انہوں نے گھوڑوں کو پلٹانے کا حکم دیا اور پھر تلوار دے ان کی گردنیں اور پنڈلیاں اڑا دیں

چنانچہ آیت کے ان الفاظ سے یہی مراد ہے:فطفق مسحا بالسوق والاعناق

بعض افراد کا نظریہ یہ ہے کہ سلیمان نے سورج کے پلٹنے کے بعد اپنی پنڈلیوں اور گردن کو وضو کے لئے دھویا اور سلیمان کے دین میں وضو کا یہی طریقہ تھا، چونکہ یہ تفسیر متعدد تفاسیر میں قبول یا رد کرنے کے اعتبار سے ذکر کی گئی ہے اس لئے ہمیں اس تفسیر کے مصادر اور مآخذ ذکر کرنے کی ضرورتی نہیں ہے۔

سید قطب تفسیر فی ظلال القرآن میں اس آیت کی تفسری میں حیران ہیں

وہ کہتے ہیں کہ تیز رفتار گھوڑوں کے واقعہ کی صحیح تفسیر میری سمجھ میں نہ آسکی، اور اس آیت کے ذیل میں عام مفسیرن نے جو کچھ بہ عنوان تفسیر نقل کیا ہے وہ سب اسرائیلیات میں سے ہے جن کی بنیاد علماء یہود کے بیانات ہیں اور یا پھر ایسی تاویلات ہیں جن کی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اسبارے میں صرف ایک حدیث قابل اعتماد ہے جسے ابو ہریرہ نے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے۔ [۱۲۱]

اب ہم اس تفسیر کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں کہ یہ تفسیر اصول عقلی اور اسلامی کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہر آیات سے بھی منافات رکھتی ہے۔

۱۔ اللہ نے ان آیات میں حضرت سلیمان کی مدح ان الفاظ میں فرمائی ہے: "نعم العبد انہ اواب"

کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ ابھی گویا اس جملہ کو لکھنے کے بعد اس کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور خدا نے سلیمان کے بارے میں ایک ایسا واقعہ نقل کرنا شروع کر دیا جو تعریف کے بجائے تنقیص پر مشتمل ہے۔

اواب کے معنی ہیں جو شخص زیادہ اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کی بارگاہ میں رجوع کرتا ہے

ایسے شخص کے لئے کسی طرح یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ گھوڑوں کی دوڑ دیکھنے میں اتنا محو ہو جائے کہ یاد خدا سے یکسر غافل ہو جائے اور نماز قضا ہو جائے۔

۲۔ مذکورہ تفسیر کو اس وقت صحیح مانا جاسکتا ہے جب لفظ احببت کے معنی میں اپنی طرف سے ضمیمہ کیا جائے مثلا کہا کہ میں گھوڑوں کی محبت کو یاد خدا (نماز) پر ترجیح دیتا ہوں، جبکہ اس ضمیمہ کی کوئی دلیل یا قرینہ آیت کے الفاظ میں نہیں ہے۔

۱۲۱۔ وہ حدیث بھی اسرائیلیات سے کم نہیں ہے جو سید قطب کی نگاہ میں صحیح ہے، شائقین مذکورہ تفسیر کی طرف مراجعہ کرسکتے ہیں

۳۔ اگر احببت کے معنی یہی ہیں جو اس سے قبل پیراگراف میں بیان کئے گئے (یعنی ترجیح دینا) تو پھر آیت میں عن ذکر ربی کے بجائے علیٰ ذکر ربی آیا ہوتا (یعنی لفظ عن کے بجائے علیٰ آیا ہوتا)

جیسے فاستحبوا العمیٰ علی الھدیٰ؛ اندھے پن کو ہدایت کی بینائی پر آنہوں نے ترجیح دی

ان استحبوا الکفر علی الایمان؛ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں۔ وغیرہ

۴۔ آیت کے ظاہری الفاظ کے مطابق تورات کی ضمیر فاعلی کا مرجع صافنات الجیاد ہے یعنی تندرفتار گھوڑے

لہٰذا اس ضمیر کو سوری کی طرف پلٹانے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ خلاف ظاہر آیت ہے، آیت میں لفظ شمس کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور بالعشی سے اس ضمیر کے مرجع کا تعین ناممکن ہے۔

۵۔ ردوھا علی: یہاں بھی ضمیر مؤنث کا مرجع گھوڑے ہی ہیں اگر مذکورہ تفسیر کو صحیح مان لیا جائے تو پھر اس ضمیر کا مرجع بھی شمس ہو گا جو آیات میں مذکور نہیں۔

۶۔ اگر مذکورہ جملہ سے مراد یہ ہے کہ سلیمان نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سورج کو میرے لئے پلٹا دو، تو یہ حاکمانہ انداز اور وہ بھی فرشتوں سے، حضرت سلیمان کی شان نبوت کے خلاف ہے۔

۷۔ انبیاء اور خاصان خدا کے لئے کائنات میں تصرف کرنا، اعجاز اور اظہار کرامتر کے طور پر قطعاً ممکن ہے اور قرآن کی متعدد آیت اس حقیقت کا ثبوت ہیں۔ لیکن حضرت سلیامن مذکورہ واقعہ کا معجزہ سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے کہ اگر نماز قضا ہوگئی تھی تو قضا کے طور پر بعد میں بگیر سورج کو پلٹائے پڑھ سکتے تھے اور اگر وہ نماز واجب نہیں بلکہ مستحب تھی (نافلہ) (جیسا کہ بعض تفاسیر میں وارد ہوا ہے) تو اس کے قضا ہونے میں کوئی حرج نہیں تھا اور اس کی ادائیگی کے لئے اپنی تکوینی ولایت کا اظہار کر کے سورج کو پلٹانے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

۸۔ جن لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ جملہ ردوھا علی سے مراد فرشتوں سے سلیمان کا سورج کو پلٹانے کی درخواست کرنا ہے اور جملہ فطفق مسحا بالسوق والاعناق سے مراد گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دینا ہیں ان کے اس نظریہ کے مطابق آیت کے دوسرے جملہ کا پہلے جملہ سے رابطہ مشکل ہو جائے گا۔

اس لئے کہ اس نظریہ کے مطابق آیت کے دوسرے جملہ کا پہلے جملہ سے رابطہ مشکل ہو جائے گا، اس لئے کہ اس نظریہ کی بنا پر یہ کہا جائے گا: کہ اے فرشتو! میر لئے سورج کو پلٹاؤ تاکہ میں وضو کروں اور نماز پڑھوں اس لئے کہ سورج کے پلٹنے کے بعد سلیمان نے نماز کو گھوڑوں سے سے انتقام لینے پر قطعاً مقدم کیا ہو گا جبکہ آیت میں وضو اور نماز کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

اگرچہ اس تفسیر کی بنا پر کہ جملہ دوم کو گردن اور پنڈلیوں کو دھونے کے معنی میں لای جائے تو پھر یہ اشکال اور اعتراض پیش نہیں آئے گا لیکن پھر ایک دوسرا اعتراض پیش آئے گا جس کو ہم اب بیان کرتے ہیں۔

۹۔ اگر اس دوسرے جملہ سے پنڈلیاں اور گردن کا بطور وضو دھونا مراد ہو تو پھر سوال یہ ہے کہ غسل (دھونے) کے لفظ کے بجائے کیوں مسح کا لفظ استعمال کیا؟

اور کیوں اعناق کو مفرد (عنق) لانے کے بجائے جمع استعمال کیا؟ ظاہر ہے کہ سلیمان کے پاس ایک ہی گردن تھی۔

تیسرے یہ کہ سوق آیت میں ساق کی جمع ہے اور ساق یعنی پنڈلی تو جمع کا لفظ استعمال کر کے اس سے تثنیہ (سلیمان کی دو پنڈلیاں) مراد لینا خلاف ظاہر ہے۔

۱۰۔ اگر جملہ فطفق مسحاً بالسوق سے مراد گردن اور پنڈلیاں کاٹنا ہے تو پھر آیت میں لفظ مسح کے بجائے لفظ قطع یا ضرب ہوتا۔ اس لئے کہ لفظ مسح کا کاٹنے کے معنی میں استعمال ہونا، لغت عرب میں شاذ و نادر ہے۔

۱۱۔ اگر ان گھوڑوں کی گردن اور پنڈلیاں کاٹنے کا مقصد اپنے غصہ کی آگ بجھانا ہے کہ گھوڑے نماز قضا ہونے کا سبب بنے، تو اس میں ان بیچارے گھوڑوں کا کیا قصور تھا وہ تو انسانی معاشرے کی خدمت کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا سلیمان کا ان بے زبان جانوروں کو قتل کرنا خلاف عقل تھا، اور اگر گھوڑوں کا قتل اس لئے تھا کہ انہوں نے یاد خدا سے گافل کر دیا تھا تو پھر دنیا کی ہر شے یاد خدا سے غلفت کا باعث ہے اور سلیمان کو چاہئے کہ پھر تو اس دنیا کی ہر مشغولیت سے ہاتھ دھولیں اس لئے کہ یہ دنیا سراسر لہو و لعب اور یاد خدا سے غافل ہونے کا سبب ہے:

انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو۔۔۔

۱۲۔ یہ تفسیر جن روایات کے مضمون کی بنیاد پر کی گئی ہے وہ روایات اس قدر مبالغہ آرائی پر مشتمل ہیں کہ قابل قبول نہیں ہیں، مثلاً سیوطی نے در منثور میں نقل کیا ہے کہ سلیمان کے ان گھوڑوں کے پر تھے اور یہ گھوڑے سلیمان کے لئے حکم خدا سے سمندر سے نکل کر آئے تھے اور ان گھوڑوں کی نظیر نہ سلیمان سے پہلے کسی نے دیکھی تھی اور نہ سلیمان کے بعد کوئی دیکھے گا۔

پھر سیوطی نے نقل کیا ہے کہ جن گھوڑوں کو سلیامن نے قتل کیا تھا ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔

ان روایات کی اس مبالغہ آرائی اور مضمون کی ندرت کو دیکھتے ہوئے بہ آسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی روایات کا تعلق اسرائیلیات سے ہے جو تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں داخل ہوگئی ہیں، اس کے بعد پھر ان روایات کی سند کی تحقیق کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے !!!۔

حضرت سلیمانؑ کے بارے میں منکرین عصمت کی دوسری دلیل

قرآن مجید نے حضرت سلیمان کی زندگی کے ایک گوشہ کی وضاحت اس طرح کی ہے:

ولقد فتنا سلیمان والقینا علی کرسیہ۔۔۔

قال رب اغفر وھب لی

ان دونوں آیات سے متعلق حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ سلیمان کے امتحان کی حقیقت کیا تھی؟

۲۔ سلیمان کا طلب مغفرت کرنا کس طرح ان کی عصمت کے مطابق ہے؟

۳۔ سلیمان نے اپنے لئے اللہ سے حکومت کا مطالبہ کیوں کیا؟

۴۔ اور پھر حکومت بھی ایسی کیوں مانگی جو کسی اور کے لئے مناسب نہ ہو۔ کیا سلیمان کے اس جملہ سے بخل کی بو نہیں آتی؟

جوابات:

۱- آیت کے ظاہری الفاظ سے بس یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ نے سلیمان کو ان کے تخت پر ایک بے جان جسم کو ڈال کر آزمایا۔ لیکن یہ جس کس کا تھا اور اس کے ذریعہ سلیمان کا امتحان کس طرح ہوا؟ خود آیت کے الفاظ سے کچھ معلوم نہیں ہوتا، آیت کے خاتمہ پر کہا: ثم اناب یعنی سلیمان نے اللہ ی طرف توجہ کی؛ اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے کوئی عمل ایسا سرزد ہوا تھا جس کی بنا پر وہ منزل امتحان میں آگئے، اور بالآخر اللہ کی طرف لوٹ آئے۔

یہاں بھی مفسرین نے بہت سے احتمالات نقل کئے ہیں جن میں سے زیادہ تر اسرائیلیات سے مشابہ ہیں اور ان کا سرچشمہ علماء یہود اور ان کی کتابیں ہیں۔

ان تمام احتمالات میں سے صرف ایک احتمال کسی حد تک قابل اعتماد ہے اور وہ یہ ہے کہ سلیمان کے ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت ہی محبت کرتے تھے اور اسی بیٹے سے مستقبل میں ان کے ارمان وابستہ تھے اللہ نے حضرت سلیمان نے اس کے بے جان جسم کو اپنے تحت یا کرسی پر پڑا ہوا پایا اور اس طرح اللہ نے انہیں اس مصیبت میں مبتلا کر کے ان کے صبر و شکیبائی کا امتحان لیا، گویا اللہ نے یہ سمجھایا کہ ہر کام کو پہلے اللہ کے سپرد کرنا چاہئے (اسی لئے ہر کام میں آئندہ کے لئے انشاءاللہ کہنے کی تعلیم ہے)۔

سخت امتحانات انسان کے لئے اس کی پوشیدہ اور خوابیدہ صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا سبب ہوتے ہیں، چنانچہ اس واقعہ میں بھی جب سلیمان نے اپنے چہیتے بیٹے کی لاش کو اپنے تخت پر اپنی نگاہوں سے دیکھا تو صبر کا مظاہرہ کیا اور اللہ کی مرضی پر راضی ہونے کا اعلان کیا۔

۲۔ مذکورہ بیان سے دوسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا کہ سلیمان نے کیوں طلب مغفرت کی؟

اس لئے کہ فرزند کی طوف توجہ اور اسے آئندہ کے لئے اپنے ارمانوں کا مرکز قرار دینا اور مستقبل میں اپنی آرزوؤں کو اس سے وابستہ کرنا، عام افراد کے لئے نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی معرفت کے لحاظ سے ترک اولیٰ بھی نہیں ہے۔

جبکہ انبیاء اور خاصان خدا چونکہ دنیا کی حقیقی معرفت رکھتے ہین اور یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس لئے ان حضرات کے لئے اپنی لمبی لمبی امیدیں اور آرزوئیں مستبقل میں اولاد سے وابستہ کرنا ایک طرح کا ترک اولیٰ ہے۔

اور اس ترک اولیٰ کا وضعی اثر، طلب مغفرت اور اللہ کی بارگاہ میں انابت اور رجوع کے ذریعہ برطرف ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اولاد سے آئندہ کی امیدوں کا وابستہ ہونا ایک فطری اور عام بات ہے لیکن خاصان خدا کے لئے ضروری ہے کہ ہر حال میں اسے اللہ کے سپرد کریں اور قضاو قدر پر راضی رہتے ہوئے اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔

اور ہمیشہ زبان پر یہ الفاظ ہوں: افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

اصلاً مغفرت کا مطالبہ گناہ کے سرزد ہونے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ انبیاء کے لئے ان کی ذمہ داریوں کی عظمت کی نشانی ہے کہ ذمہ داریوں کی ادائگی کے احساس نے اللہ کی بارگاہ مین انہین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے احساس خطا کے ساتھ استغفار پر مجبور کر دیا ہے۔ اور اس راہ میں اگر وہ کوئی مباح کام بھی نجام دیتے تھے جو شان نبوت کے مطابق نہی ہو تا تھا تو اس کے بابت بھی اللہ سے مغفرت کا مطالبہ کرتے تھے۔

۳۔ تیسرے سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ تاریخ بشریت میں زیادہ تر حکومتوں میں ظلم وجور اور ناانصافی رہی ہے، اس بنا پر جب بھی ملک و حکومت کی بات آتی ہے تو تبادر ذہنی کی بنا پر لوگوں کے ذہن میں ظلم اور ناانصافی کا خیال آتا ہے اور طاہر ہے کہ ایسی حکومت جس کی بنیاد ظلم و ستم پر قائم ہو کسی بھی عقلمند انسان کے لئے سزاوار نہیں ہے چہ جائیکہ انبیاء اور خاصان خدا۔

لیکن حضرت سلیمان نے جس حکومت کا اللہ سے مطالبہ کیا ہے وہ حکومت پوری طرح حکم خدا سے چلنے والی اور عدل و انصاف کو رائج کرنے والی حکومت تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت در حقیقت دین خدا اور خلق خدا کی خدمت کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور چونکہ عام طور سے حکومت کے ذکر سے ظلم و ستم بھری حکومت کا خیال ذہن میں آتا ہے اسی بنا پر اللہ نے قرآن میں جب اپنی ذات کا بادشاہ (ملک) کہہ کر تعارف کرایا تو اس کے بعد بلا فاصلہ لفظ قدوس استعمال کیا جو پاکیزگی کے مبالغہ کے لئے لغت عرب میں استعمال ہوتا ہے

ھو اللہ الذی لا الہ الا اللہ ھو الملک القدوس

گویا اللہ کی بادشاہت دنیا والوں کی بادشاہت کی طرح گناہ اور ظلم سے آلودہ نہیں ہے بلکہ پاک وپاکیزہ ہے سیرت نگاروں نے پیغمبرؐ کا یہ قول نقل کیا ہے: ما انا بملک یعنی میں بادشاہ نہیں ہوں، اس لئے کہ لوگوں کا ذہن اس لفظ سے آلودہ بادشہات کی طرف جاتا ہے، لیکن اگر کوئی حکومت دین خدا اور اللہ کی مخلوق کی خدمت رسانی کا سبب بن جائے تو ایسی حکومت قابل تحسین ہے اس لئے کہ ایسی حکومت بشریت کی سعادت اور فلاح و بہبود کا ذریعہ ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت سلیمان نے ایسی ہی حکومت کا اللہ سے مطالبہ کیا تھا جس کا مقصد بشریت کو سعادت کی منزلوں تک پہونچانا تھا اور ایسی حکومت در حقیقت لطف کدا سے ہی حاصل ہو سکتی ہے جو صرف خاصان خدا ہی سے مخصوص ہے۔

چنانچہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت سلیمان جیسے عادل اور متواضع بادشاہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

ارایتم ما اعطی سلیمان بن داؤد۔۔۔ الخ

کیا تم نے سلیمان کو اللہ کی دی ہوئی قدرت اور عظمت کے بارے میں سنا ہے کہ اللہ نے کتنی بڑی حکومت اور طاقت انہیں عطا کی تھی؟

لیکن اتنی بڑی حکومت پانے کے بعد بھی سلیمان کے یہاں خضوع و خشوع اور تواضع و فروتنی کا ہی اضافہ ہوا سلیمان حکومت پانے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں اتنا خاضع ہو چکے تھے کہ پھر کبھی سلیمان نے اللہ کے احترام میں منہ اٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھا۔

۴۔ اس گفتگو کے بعد چوتھے سوال کا جواب بھی خود بخود واضح ہو جاتا ہے، اس لئے کہ قرآن نے اس کے بعد کی آیات میں سلیمان کی حکومت کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے: ہم سلیمان کو حکومت عطا کی اور ہواؤں کو بھی ان کے لئے مسخر کر دیا کہ انہیں کے حکم سے جہاں وہ جانا چاہتے تھے نرم رفتار سے چلتی تھی اور شیاطین میں سے تمام معماروں اور غوطہ خوروں کو ان کا تابع بنا دیا۔

اور ان شیاطین کو بھی جو سرکشی کی بنا پر زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، یہ سب میری عطا ہے اب چاہے لوگوں کو دے دو یا اپنے پاس رکھو، تم سے حساب نہ ہو گا (یعنی ہماری اس عطا کا تم گمان اور حساب بھی نہیں لگا سکتے)

ایسی عظیم قدرت جس نے ساری کائنات کو قبضہ میں کر رکھا ہو اور سرکش افراد کو بھی، ظاہر ہے کہ سوائے معصوم کے کسی کے لائق نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی طاقت اگر غیر معصوم کو دے دی جائے تو وہ اس کا مصرف صرف اپنے نفسانی خواہشات کی تکمیل اور بشریت کی سرکوبی کو قرار دے گا۔ ایسی حکومت ایک سلیمان جیسے معصوم کے لئے ہی سزاوار تھی جنہوں نے اس حکومت کو ہدف بنانے کے بجائے وسیلہ قرار دیا اور اس حکومت کو ہدف بنانے کے بجائے وسیلہ قرار دیا اور اس حکومت کے طفیل میں بشریت کی سعادت کے اسباب فراہم کئے۔

اور اس راہ میں اپنے ذاتی خواہشات کو بالای طاق رکھ کر صرف حکم خدا کی اطاعت کی اور چونکہ سلیمان نے اللہ سے ایسی حکومت مانگی تھی جس میں ہوا، سمندر شیاطین اور تمام کائنات پر قبضہ ہو اور ایسی حکومت معصوم کے علاوہ کسی دوسرے کے شایان شان نہیں تھی۔

اس لئے آپؑ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ "خدایا! مجھے ایسی حکومت دے جو میرے بعد کسی دوسرے کے لئے سزاوار نہ ہو"

سلیمان کی مراد اس دعا میں کسی دوسرے سے، عام افراد بشر تھے نہ کہ معصوم ہستیاں، جیسے خود آپؑ کے والد حضرت داؤد علیہ السلام

اس لئے کہ اگر اپنے ہم پلہ دیگر افراد بھی موجود ہوں تو اللہ سے خصوصی درخواست کرنا اور کسی خصوصیت کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہے جو انسان کامل کی شان کے خلاف ہے، چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ سلیمان اس طرح اپنی حکومت کا ایک امتیاز چاہتے تھے۔ انہوں نے اللہ سے ایسی حکومت کی درخواست کی جو نبوت و رسالت کی نشانی ہو اور انبیاء کے معجزات میں اس کا شمار ہو۔

لہٰذا اگر انہوں نے یہ الفاظ استعمال کئے: لاینبغی لاحد من بعدی۔ تو ان الفاظ سے مراد صرف وہ انسان ہیں جو ان کی نبوت و رسالت کے زیر نگیں ہیں اور جہاں تک ان کی نوبت کا دائرہ ہے، نہ کہ تمام انسانات جو ان کے بعد سے قیامت تک روی زمین پر قدم رکھیں گے، حتیٰ اگر معصوم بھی ہوں اور حکومت کا استعمال صرف کلمہ توحید کو دنیا میں پھیلانے اور عدل و انصاف قائم کرنے میں کریں۔

لہٰذا حضرت سلیمان کی مراد ان الفاظ سے مطلق نہیں ہے جو بعد کے معصومین بھی ایسی حکومت کے لائق نہ ہو (بلکہ امام زمانہؑ کی حکومت کا انداز حضرت سلیمان کی حکومت کے انداز سے کہیں بہتر ہو گا)

۷۔ قرآن اور حضرت ایوبؑ کی عصمت

تفسیر آیات

قہرمان صبر و استقامت

حضرت ایوبؑ اللہ کے وہ نبی ہیں جن کا نام صبر و استقامت کے نمونہ کے طور پر زباں زد خلائق ہے۔

موجود توریت میں حضرت ایوب کو ایک نبی کے عنوان سے یاد نہیں کیا گیا ہے لیکن قرآن میں آپ کا اسم گرامی انبیاء کے ناموں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ نساء آیت ۱۶۳ اور سورہ انعام آیت ۸۴ میں ہے۔

لیکن قرآن مجید نے حضرت ایوبؑ کے بارے میں چند جملے ایسے نقل کئے ہیں جو ظاہری اعتبار سے شان نبوت اور شان عصمت کے مطابق نہیں ہیں۔

جیسے: مسنی الضر

مسنی الشیطان بنصب و عذاب

پہلی آیت بیماری اور مصیبت صبر کے بجائے شکوہ کا مظہر ہے اور دوسری آیت شیطان کے قبضہ یا حملہ کا۔

اور دونوں ہی باتیں شان عصمت سے منافات رکھتی ہیں۔

جواب: سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دیں:

الف: آیت میں تینوں الفاظ (ضر، نصب اور عذاب) کے لغوی معانی کیا ہیں؟

ب: حضرت ایوب کی مصیبت کیا تھی جس کا صرف اجمالی اظہار ان الفاظ سے ہو رہا ہے۔

ج: اس امتحان صبر میں شیطان کا دخل کس انداز سے ممکن ہے؟

الف: قرآن نے سورہ انبیاء اور خاص طور سے سورہ ص میں حضرت ایوب کا واقعہ بیان کیا ہے:

وایوب از نادیٰ ربہ۔۔۔۔الخ

فاستجبنا لہ۔۔۔۔۔

سورہ ص میں اس انداز سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے:

اذ کر وعبدنا ایوب۔۔۔۔الخ

دونوں سوروں کی آیات مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں صرف انداز تعبیر مختلف ہے۔

اب ہم مذکورہ تینوں الفاظ کے لغوی معانی کی وضاحت کرتے ہیں:

ضر سے مراد کیا ہے؟

ضر بروزن شر فائدہ کا مقابل ہے یعنی نقصان

جیسا کہ آیت ہے: قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً۔۔۔۔الخ

لیکن ضر بروزن حر بدحالی اور گرفتاری کے معنی میں ہے جس کا مقابل خوشحالی ہے۔

یہ لفظ اس انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے جو فقر و تنگدستی یا شدید بیماری میں مبتلا ہو گیا ہو جیسا کہ آیت ہے:

واذا مس الانسان الضر دعانا۔۔۔۔

اس بنا آیت کے الفاظ (مسنی الضر) سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک قسم کی بدحالی ایوب کے شامل حال ہوئی تھی، لیکن یہ بدحالی کس قسم کی تھی یہ آیت سے واضح نہیں ہے، اس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

نُصب اور عذاب سے مراد کیا ہے؟ نصب بروزن ظُلم، زحمت و مشقت اور تھکن کے معنی میں ہے

اور اگر یہ لفظ بیماری، شر اور بلا و مصیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو وہ اس لئے کہ یہ تمام چیزیں زحمت و مشقت کا سبب ہوتی ہیں ۔(لہٰذا یہ استعمال مجازی ہے)

لفظ عذاب باب تفعیل کے فعل عذب کا مصدر ہے، بعض اہل لغت نے اس کو انجام کے معنی میں بھی لیا ہے

اگرچہ اس لفظ کے اصلی معنی سزا اور مؤاخذہ کے نہیں ہیں، بلکہ سزا اور مؤاخذہ اس کے اصلی معنی کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے۔ عذاب کے معنی وسیع ہیں اور ہر قسم کی انسانی تکلیف کے لئے استعمال ہوتا ہے چاہے تکلیف جسمانی ہو یا روحانی خواہ انسان اس تکلیف کا حقدار ہو یا نہ ہو، اسی بنا پر شکنجہ کسنے والے ظالم کو معذب اور اسکے اس عمل کو عذاب کہا جاتا ہے

ابن فارس کا کہنا ہے کہ "عذاب اصل میں ضرب کے معنی میں ہے، اور اس وجہ سے تازیانہ کے گوشہ کو عذبہ کہتے ہیں، لیکن بعد میں تمام سخت کاموں کو جو انسانی طاقت اور برداشت سے باہر ہوں، عذاب کہا جانے لگا"

بہر حال ان تینوں الفاظ کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ایک بدترین حالت اور بدحالی میں حضرت ایوب مبتلا ہوئے اور انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس حالت کو برطرف کر دے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں مبتلا ہونا گناہ کے سرزد ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

ب: حضرت ایوبؑ کی بدحالی

حضرت ایوب کی بدحالی کا تفصیلی ذکر ان آیتوں میں نہیں ہوا ہے۔ صرف سورہ ص کی آیت ۴۲ میں اتنا ذکر ہے کہ ایوب کی پریشانی یا بیماری چشمہ کے پانی میں غسل کرنے سے جو حکم خدا سے ان کے قدموں میں، زمین سے جاری ہوا تھا برطرف ہو گئی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی پریشانی درواقع ایک جسمانی بیماری تھی۔

آیت: ارکض برجلک ھذا مغتسل۔۔۔

ایوب کے پیروں میں چشمہ کا پھوٹنا ویسے ہی تھا جس طرح اسماعیل کے قدموں میں زمزم کا چشمہ جاری ہوا اور یہ سب حکم خدا اور اعجاز الٰہی سے تھا جس طرح اللہ نے موسیٰ کو حکم دیا:

ان اضرب بعصاک الحجر۔۔۔

روایات میں بھی حضرت ایوب کی پریشانی بیماری کو ہی بتایا گیا ہے حد یہ ہے کہ بعض روایات میں ان کی بیماری کی اس طرح تشریح کی گئی ہے جو شان انبیاء کے بھی خلاف ہے اور اس قسم کی روایات کا شمار اسرائیلیات میں ہے جن کا مصدر علماء یہود اور ان کی کتابیں ہیں

امام جعفر صادقؑ ایک مفصل روایت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

ایوبؑ کی بیماری نے ان کے چہرے کی شادابی کو ذرہ برابر بھی متاثر نہیں کیا تھا اور بدن کے کسی بھی حصہ پر برا اثر نہیں ڈالا تھا اور ہرگز ایسا نہیں تھا کہ بیماری نے ان کے جسم میں لوگوں کی نفرت اور بیزاری کے اسباب فراہم کر دئے ہوں (جیسا کہ مشہور ہو گیا ہے)

ج: حضرت ایوبؑ کی بیماری میں شیطان کا دخل:

حضرت ایوب مقام دعا میں کبھی کہتے تھے: مسنی الضر

اور کبھی کہتے تھے: مسنی الشیطان بنصب وعذاب

ان دونوں کی تفسیر کے ذیل میں یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ حضرت ایوب کی بیماری میں شیطان کا کیا دخل تھا؟

مذکورہ دونوں جملوں کی تفسیر میں دو راستے ہیں:

۱۔ ضر سے مراد حضرت ایوب کی وہی طولانی بیماری ہے اور نصب و عذاب جو زحمت و مشقت اور تکلیف کے معنی میں ہے، اس سے مراد جسمانی بیماری کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے اور وہ راہبوں کا شماتت یعنی طعن و تشنیع کرنا تھا جو شیطان کے اشارہ اور وسوسہ کی بنا پر حضرت ایوب کو ان کی بدحالی کا طعنہ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم نے کون سا گناہ انجام دیا ہے جو ان حالات میں گرفتار ہو گئے؟

یہ وہ منزل تھی جہاں پہونچ کر حضرت ایوب کا کاسہ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے اپنی اس بدحالی کا عامل شیطان کو قرار دیا اور پھر اللہ سے اس پریشانی اور بدحالی کو برطرف کرنے کی درخواست کی۔

امام جعفر صادق فرماتے ہیں: "ایوب بغیر گناہ انجام دئے ہوئے اللہ کے سخت ترین امتحان میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے اس پر صبر کیا، یہاں تک کہ لوگوں نے ان کی مذمت اور سرزنش شروع کر دی جس پر انبیاءالٰہی صبر نہیں کر سکتے۔"

اس بنا پر شیطان کا ان کی جسمانی بیماری میں کوئی دخل نہیں تھا بلکہ شیطان کا دخل صرف ان کی روحانی تکلیفوں میں تھا جو راہبوں کے طعنوں کی شکل میں حضرت ایوبؑ کو دیکھنا پڑیں اور شیطان کے دخل کا مفہوم بھی یہ تھا کہ وہ وسوسہ کے ذریعہ بنی اسرائیل کے راہبوں کی تشویق و تحریک کرتا تھا کہ وہ ایوب کی اس طرح مذمت کریں جس سے ایوب کو روحانی تکلیف ہو۔

۲۔ آیت میں ذکر شدہ تینوں الفاظ سے مراد صرف جسمانی بیماری ہی ہے اور اس بیماری میں کسی حد تک شیطان کا دخل تھا۔

جن مفسرین نے اس احتمال کو ترجیح دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ "شیطان نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ خدایا! اگر تیری نگاہوں میں ایوب تیرے شکر گزار بندے ہیں تو وہ تیری نعمتوں کی بنا پر ہیں جو تو نے انہیں دی ہیں۔

لیکن اگر تو مجھے ان پر مسلط کر دے اور میں ان پر ملسط ہو کر ان سے تیری تمام نعمتوں کو چھین لوں تو پھر ایوب کو تو ہرگز شاکر نہیں پائے گا۔

چنانچہ حکم خدا سے شیطان نے ان کے مزاج اور ان کے مال میں تصرف کیا اور وہ بیامر ہو گئے، مگر پھر بھی شیطان نے دیکھا کہ ایوب کے شکر کا سلسلہ جاری ہے اور وہ پہلے کی طرح اب بھی اللہ کے شکر میں منہمک ہیں۔ یہ دیکھ کر شیطان کا نظریہ بدل گیا۔ اسی بنا پر ایوب نے ایک جگہ مسنی کا فاعل الضر کو قرار دیا اور دوسری جگہ شیطان کو: مسنی الشیطان۔

مذکورہ تفسیر اور احتمال اگرچہ بعید ہے لیکن پھر بھی محال نہیں ہے اور اصول و معارف اسلامی کے خلاف نہیں ہے، اس لئے کہ انبیاء جس طرح مادی اسباب سے متاچر ہو کر بیمار ہو جاتے ہیں اسی طرح ایک مرتبہ یہ بھی ممکن ہے کہ اذن خدا سے شیطان کے ذریعہ اپنی تندرستی اور مال سے محروم ہو جائیں۔

زمخشری نے تفسیر کشاف میں اس احتمال کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر شیطان کو اتنا اختیار حاصل ہو تو پھر روی زمین پر کسی بھی مرد مومن کی جان و مال شیطان کے شر سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ شیطان کا کام صرف لوگوں کے دلوں میں وسوسہ کرن اہے لیکن جان و مال میں تصرف کی طاقت نہیں رکھتا۔

زمخشری کا یہ بیان اس وقت صحیح ہے جب شیطان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہی اختیار حاصل ہو نہ کہ کسی ایک مقام پر اور قہ بھی اذن خدا کی بنا پر اور متعدد د مصالح پر مشتمل۔

آخر میں دو نکتوں کی یاد آوری انتہائی ضروری ہے:

۱۔ حضرت ایوب کے اس امتحان سے اللہ کا مقصد کیا تھا؟

اللہ کے امتحان کا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ بندوں کی حقیقت کا علم نہیں رکھتا بلکہ اس کے امتحان لینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندوں کے اندر پوشیدہ صلاحیت اور استعداد راز سربستہ کی شکل انسانی وجود میں محفوظ رہتی ہے اور امتحان کی منزلوں میں آنے کے بعد وہ قابلیت انسان کی عملی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتی ہے اور یہی خلقت انسانی کا اصل ہدف ہے۔

حضرت ابراہیم، حضرت ایوب اور دیگر انبیاء الٰہی بھی سخت ترین امتحانات میں اللہ کی جانب سے مبتلا ہوئے اور انہوں نے دنیا کی نگاہوں میں یہ ثابت کر دیا کہ ہم سوائے ذات رب العزت اور اس کی مرضی کے کچھ بھی نہیں چاہتے، یہاں تک کہ اس راہ میں انہوں نے بیٹے کا ذبح کرنا اور طولانی بیماریاں بھی برداشت کر لیں۔ گویا یہ سخت امتحانات ہی ہیں جو انسان کے خلوص کو آمیزش سے ممتاز بناتے ہیں۔

جس انسان نے اٹھارہ یا بیس سال تک مسلسل جسمانی بیماری اور فقر و ناداری کی سخت ترین منزلیں برداشت کی ہوں اور ہمیشہ ان حالات میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا رہا ہو حق ہے کہ اللہ اس کی شان میں ان الفاظ میں رطب اللسان ہو:

انا وجدناہ صابراً نعم العبد انہ اواب

ظاہر ہے کہ یہ توصیف کسی بھی انسان کی سخت ترین حالات میں بھی صابر و شاکر رہ کر ہی کی جاسکتی ہے۔

سورہ انبیاء کی آیت ۸۴ کے مطابق حضرت ایوب کی صحت کی واپسی اللہ کی رحمت کا نمونہ اور دنیاوالوں کے لئے درس عبرت اور باعث تذکر ہے:

رحمۃ من عندنا وذکریٰ للعابدین

اگرچہ اللہ کے امتحانات اور آزمائشوں کا فلسفہ اسی امر میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی اہداف مضمر ہوتے ہیں جن کی تفصیل ہم نے اسی کتاب میں صفات خدا کے عنوان سے عدل کی بحث میں بیان کی ہے۔

۲۔ حجر ایوب کی قسم اور شرعی حیلہ اور تدبیر:

حضرت ایوب نے اپنی بیماری کے زمانے میں اپنی بیوی کی ایک کوتاہی کو دیکھ کر یہ قسم کھائی تھی کہ بیماری سے نجات پانے کے بعد بیوی کو جسمانی تنبیہ کریں گے؛ چنانچہ صحت پانے کے بعد اپنی قسم پر عمل کرنا چاہا تو حکم خدا ہوا:

وخذ بیدک ضغثا۔۔۔

قسم پر اس طرح عمل کرنا کیا یہ شرعاً صحیح ہے اور قسم کی تعمیل شرعی کہلانے کا حقدار ہے؟

جواب: اگرچہ حضرت ایوب کی زوجہ اپنی ایک کوتاہی کی بنا پر شوہر کی قسم کے مطابق اس تنبیہ کی حقدار تھیں لیکن اس کے مقابلے میں انہوں نے بیماری اور تنگدستی کی طویل مدت میں شوہر کی بے مثال خدمات انجام دی تھیں حد یہ کہ سب لوگوں نے حضرت ایوب کا بائیکاٹ کر دیا تھا لیکن یہ وفادار زوجہ پھر بھی شوہر کی خدمت میں لگی رہیں ایسی زوجہ کا حق ہے کہ اسے حکم خدا کے مطابق شوہر کا پروانہ عفو حاصل ہو اور

اس کی عظیم خدمات کے مقابلہ میں مختصر سی کوتاہی سے چشم پوشی کی جائے، لیکن دوسری طرف مسئلہ نام خدا اور قانون خدا تھا اس لئے کہ ہر حال میں نام خدا اور قانون خدا کی عظمت ہر شے پر مقدم ہے۔

ان دونوں پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے اللہ نے استثنائی اور خصوصی طور پر اپنی تشریعی ولایت کی بنیاد پر اپنے قانون میں حضرت ایوب کی زوجہ کی خدمات کے مطابق ادنیٰ سی تخفیف کر دی اور یہ صرف ایک خصوصی واقعہ تھا ورنہ اس واقعہ سے عام زندگی میں استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ قانون خدا قانون خدا ہے اس میں کوئی ترمیم یا تدبیر ممکن نہیں ہے۔

واجبات الٰہی کو جائز بنا کر ترک نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح محرمات الٰہی کو تدبیر کے ذریعہ حلال نہیں کیا جا سکتا۔ قانون میں ترمیم کا حق بعض مصالح کی بنا پر صرف اللہ ہی کو حاصل ہے جو صاحب قانون ہے بندوں کا کام صرف قانون کی تعمیل ہے۔

۸۔ قرآن اور حضرت یونس کی عصمت

تفسیر آیات:

منکرین عصمت کی ایک دلیل قرآن کی وہ آیات ہیں جن میں حضرت یونسؑ کا قصہ بیان ہوا ہے

اور وہ آیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ فلولا کانت

۲۔ وذالنون اذ ذھب مغاضباً فظن ان لن نقدر علیہ فنادی فی الظلمات ان لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

فاستجبنا لہ ونجیناہ من الغم وکذالک ننجی المومنین

۳۔ اذ ابق الی الفلک المشحون

۴۔ فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت اذ نادیٰ وھو مکظوم

ان تمام آیات میں دقت کرنے سے ان تمام سوالوں کے جوابات واضح ہو جاتے ہیں جو حضرت یونس کے واقعہ سے متعلق پائے جاتے ہیں سب سے پہلے ہم حضرت یونس کا واقعہ یہاں نقل کرتے ہیں:

حضرت یونسؑ نے سرزمین عراق پر لوگوں کو حق کی دعوت دی لیکن اس دعوت کا کوئی فائدہ انہیں دکھائی نہیں دیا، پوری قوم میں صرف دو آدمی ان پر ایمان لائے جن میں سے ایک عالم تھا اور دوسرا عابد۔ عابد نے حضرت یونس کو قوم کے لئے بد دعا کرنے کا مشورہ دیا کہ اللہ سے عذاب کی درخواست کریں۔

عالم نے حضرت یونس کو قوم کی بد عملی اور گمراہی پر صبر کرنے کی تلقین کی، حضرت یونس قوم کے حالات پر صبر کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان کا کاسہ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے بد دعا کر دی، اللہ نے بھی نزول عذاب کا کسی مقرر دن میں وعدہ کر لیا، جس وقت عذاب کا دن قریب آ گیا حضرت یونس اس عابد کو اپنے ساتھ لے کر قوم کو چھوڑ کر شہر سے باہر نکل گئے لوگوں نے جب عذاب کی نشانیاں دیکھیں تو دوڑ کر اس عالم کے پاس آئے اور راہ حل پوچھا، اس نے قوم سے کہا: "اللہ کی پناہ مانگو، گریہ وزاوری کرو، بیابان میں توبہ کے لئے نکل پڑو، بچوں کو ماؤں سے جدا کر دو اور اسی طرح حیوانات سے ان کے بچوں کو الگ کر دو اور پھر سب مل کر رو رو کر توبہ کرو۔

ساری قوم نے اس عالم کے مشورہ کے مطابق ایسا ہی کیا، چنانچہ قہر خدا رحمت میں تبدیل ہو گیا اور آثار ہوا عذاب واپس جاتا دکھائی دیا۔ ادھر یونسؑ (قوم کے اس واقعہ سے آگاہ ہونے سے پہلے یا آگاہ ہونے کے بعد لیکن قوم کے ایمان سے آگاہ ہوئے بغیر)

سمدنہ کے سفر کے لئے سمندر کے کنارے آکر کشتی پر سوار ہوئے کچھ دور کشتی کے چلنے کے بعد سمندر میں طوفان آگیا، اب کشتی ڈوبنے کی حالت میں آئی تو ناخدا نے کہا کہ قرعہ اندازی کی جائے اور قرعہ کے مطابق ایک آدمی کشتی سے دریا میں اترے تا کہ کشتی ہلکی ہو جائے۔

یہاں پر ایک روایت یہ ہے کہ سمندر کی بڑی مچھلی نے کشتی کے سامنے آکر غذا کا مطالبہ کیا جس کی بنا پر قرعہ کے ذریعہ اس کی غذا کا انتظام کیا گیا، ایک دوسرے قول کی بنا پر مچھلی نے کہا کہ اس کشتی میں کوئی غلام ہے جو اپنے مولا کے پاس سے بھاگ کر آیا ہے اور قرعہ کے ذریعہ اسے کشتی سے باہر پھینکا جائے۔

بہر حال قرعہ انجام پایا اور وہ حضرت یونس کے نام نکلا حضرت یونس نے قرعہ کے مطابق خود ہی دریا میں چھلانگ لگا دی، فوراً اس ماہی نے انہیں نگل لیا؛ اب حضرت یونسؑ نے تین تاریکیوں (سب، سمندر اور شکم کی تاریکی) میں اللہ کی تسبیح کی، اس تسبیح کے نتیجہ میں اللہ نے حضرت یونسؑ کو نجات دی، اور مچھلی نے آپ کو ایک مدت کے بعد سمندر کے کنارے پر اگل دیا، آپؑ دوبارہ اپنی قوم کی طرف واپس آگئے۔[۱۲۲]

اب اس واقعہ سے متعلق ہم سوالات اور ان کے جوابات پیش کرتے ہیں:

۱۔ قوم کی توبہ کیوں اللہ نے قبول کی؟

جواب: قرآن گواہی دے رہا ہے کہ عذاب کے آجانے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ وہ عذاب انہیں ہلاک کر دے گا جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۹۰ میں دریا میں غرق ہوتے وقت فرعون کے ایمان لانے کا تذکرہ ہے، جس پر اللہ نے اعتراض آمیز لہجہ میں کہا:

الآن وقد عصیت قبل۔۔۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عذاب کو آتا دیکھ کر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں تو پھر حضرت یونس کی قوم کا عذاب کیونکر واپس ہو گیا جبکہ وہ بھی عذاب دیکھ کر ہی ایمان لائے تھے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان کی متعدد انواع واقسام ہے اور ہر ایک احکام و آثار الگ الگ ہیں، ایمان کبھی واقعی ہوتا ہے اور کبھی ظاہری اور غیر واقعی۔

مذکورہ قصہ میں جناب یونس کی قوم کا ایمان اگرچہ عذاب کی نشانیاں دیکھ کر تھا لیکن ان کا ایمان آگاہی اور پوری طرح بصیرت پر مشتمل تھا۔ عذاب کی نشانیوں نے قوم یونس کے جہالت اور نادانی کے پروں کو پوری طرح چاک کر دیا تھا اور اس کے بعد پھر زندگی پھر اس قوم نے کفر اختیار نہیں کیا، گویا عذاب کی نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ایک قسم وہ ہے جہاں ایمان کا مقصد صرف عذاب سے بچنا ہے اور بس (جیسا کہ فرعون کے قصہ ہے) اور دوسری قسم وہ ہے کہ جہاں عذاب کی نشانیوں کو دیکھ کر ہی ایمان پیدا ہوا ہے لیکن اب ایمان اپنی واقعی صورت میں ہے جس کا مقصد عذاب سے بچنے کے بجائے بصیرت اور معرفت خدا ہے۔

۱۲۲۔ حضرت یونس کا پورا قصہ تفاسیر میں موجود ہے اور اس کی تفصیل علامہ مجلسی نے بحار میں اور علامہ بحرانی نے تفسیر البرھان میں اور صاحب تفسیر نور الثقلین نے بیان کی ہے۔

اور یہ تشخیص دینا کہ کس جگہ ایمان کا ہدف کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، اسی اعتبار سے احکام و آثار میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے؛ چنانچہ حضرت یونس کی قوم کو اللہ نے نجات دیدی

ومتعناھم الیٰ حین

:ہم نے یونس کی قوم کو ایک مدت تک کی زندگی اور آسائش عطا کر دی۔

اسی لئے جب یونس دوبارہ قوم میں واپس آئے تو قوم نے پوری گرمی کے ساتھ یونس کا استقبال کیا گویا عذاب کو دیکھ کر روح میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ پھر زندگی بھر توحید کے راستے منحرف نہیں ہوئے، جبکہ قوم یونس کے علاوہ دیگر اقوام کے ایمان کی یہ حقیقت نہیں تھی بلکہ خدا جانتا تھا کہ یہ اگر عذاب سے نجات بھی پاجائیں گے تب بھی دوبارہ اپنے گذشتہ راستے پر گامزن ہو جائیں گے اور کفر و شرف و استکبار کی طرف واپس لوٹ جائیں گے جیسا کہ فرعون کی زندگی میں یقین تھا۔

اس لئے کہ اللہ نے فرعون والوں پر اس سے پہلے بھی متعدد عذاب نازل کئے لیکن جب انہوں نے آکر موسیٰ کے دامن سے پناہ لی اور عذاب بر طرف ہو گیا تو پھر انہوں نے اپنے پرانے طریقہ پر ہی عمل کیا۔

فارسلنا علیہم الطوفان

ولما وقع علیہم الرجز

فلما کشفنا عنہم الرجز

لہٰذا یہ واضح ہو گیا کہ حضرت یونس کی قوم دیگر اقوام سے اسی لئے ممتاز ہو گئی کہ انہوں نے عذاب کو دیکھ کر نصیحت حاصل کی اور حقیقی بورا ایمان کا اعلان کیا جس کا ثبوت بعد میں کبھی نہ پلٹنا ہے اور یہ بات از قبل اللہ کے علم میں تھی۔

لیکن قوم فرعون کا ایمان واقعی نہ تھا جس کا ثبوت مذکورہ آیات میں موجود ہے۔

انہوں نے اس سے پہلے بھی ایمان کا وعدہ کر کے عذاب کو بر طرف کرایا تھا لیکن بعد میں پھر استکبار کا راستہ اپنایا اسی لئے سب کے سب دریام یں غرق ہو گئے اور اب ان کے ایمان کا کاوئی اعتبار نہ تھا۔

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عذاب کو دیکھ کر بھی ایمان کی دو قسمیں ہیں:

الف: اختیاری ایمان۔ عذاب کی نشانیاں دیکھ کر کبر و جہالت کے پردے چاک ہو جائیں اور دلوں میں ایسا ایمان راسخ ہو جائے کہ اگر عذاب بر طرف بھی ہو جائے تب بھی بقاء ایمان میں کوئی فرق نہ آئے ایسا ایمان حقیقی ایمان کہلاتا ہے جو قوم کی نجات کا ضامن ہوتا ہے۔

ب: اضطراری ایمان۔ اس ایمان کا سرچشمہ بصیرت اور آگاہی کے بجائے خوف عذاب ہے ایسے ایمان سے روح کا دامن کبر و جہالت کی گرد سے پاک نہیں ہوتا، جہالت کے پردے ویسے ہی باقی رہتے ہیں۔

ایسا ایمان قوم کی نجات کا ضامن نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے: ولو شاء ربک لامن من فی الارض جمیعاً

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ روی زمین پر تمام لوگ ایمان لے آئیں اور اس کا ثبوت انبیاء کا سلسلہ ہے۔ اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں ایمان سے مراد اجباری اور اضطراری ایمان ہے جو اللہ کی اجباری اور تکوینی مشیت سے قابل حصول ہے لیکن اللہ ایسا ایمان نہیں چاہتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ بندے معرفت اور بصیرت کے ساتھ مکمل حریت اور آزادی کے ساتھ اس پر ایمان لائیں اور اس کے رسولوں کا اتباع کریں گویا اللہ بندوں کے ایمان کا خواہشمند بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ اختیاری ایمان کا طلبگار ہے جسے ارادہ تشریعی کہا جاتا ہے اور اجباری ایمان کا طلبگار نہیں ہے جو تکوینی ارادہ الٰہی سے ممکن ہے۔

۲۔ عذاب کا برطرف کرنا کیا حضرت یونسؑ کی توہین اور تکذیب نہیں تھا؟

اس میں کوئی شک نیہں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسولوں کی مدد کرتا ہے اور کبھی بھی ان کی تکذیب کے اسباب فراہم نہیں ہونے دیتا؛ لہٰذا اگر اللہ کا کوئی نمائندہ کوئی غیب کی خبر سنائے یا پیشگوئی کرے اور وہ واقع نہ ہو تو سادہ لوح عوام کے اذہان میں غلط فہمی ضروری پیدا ہوتی ہے لیکن واقعہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے یہ غلط فہمی بعد میں برطرف ہو جاتی ہے اور خبر کی سچائی کے ساتھ ساتھ اس کے واقع نہ ہوسکنے کے اسباب بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

حضرت یونس کے قصہ میں ایسا ہی ہوا کہ قوم کی نظروں کے سامنے عذاب کی نشانیاں ظاہر ہو گئیں اور سب کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر کوئی چارہ اندیشی نہ کی گئی تو یہ عذاب آ کر رہے گا اور یونس کی پیشگوئی سچ ہو کے رہے گی۔ اسی یقن کے س اتھ وہ لوگ عالم کے پاس گئے اور اس عالم کی تعلیم کے ماطقب ساری قوم نے مخصوص انداز سے اللہ کی بارا گہ میں توبہ و استغفار کیا، حیوانات اور ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا اور بیابان میں آکر گریہ کیا اور اس طرح اللہ کی رحمت کے حق دار ہو گئے اور قرآن کی اس آیت کو گویا انہوں نے عملی جامہ پہنا دیا:

ولو ان اھل القریٰ امنوا۔۔۔

تاریخ انبیاء میں یہی صرف ایک واقعہ نہیں ہے جہاں نمائندہ الٰہی کی پیشگوئی مصلحت خدا کی بنا پر واقع نہ ہو سکی بلکہ جناب یہونس کی قوم کے واقعہ سے مشابہ دیگر واقعات بھی تاریخ اقوام انبیاء میں پائے جاتے ہیں جہاں نبی کی پیشگوئی واقع نہ ہو سکی لیکن ان تمام واقعات میں ایسے حقائق اور اسباب موجود تھے جنہوں نے نبی کی صداقت کا بھی تحفظ کیا کہ نبی کی خبر جھوٹی نہیں اور واقعہ سچا نہ ہونے کی وجہ بھی واضح کی کہ اگر وہ واقعہ پیش نہیں آسکا ہے تو اس میں خصوصی طور پر خدائی مصالح کارفرما تھے۔

جس سے نبی کا تقدس بھی پائمال نہیں ہوا اور قوم بھی عذاب سے محفوظ ہو گئی

۳۔ منکرین عصمت اور سورہ انبیاء آیت ۸۷

مذکورہ آیت میں منکرین عصمت کی رد کرنے کے لئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات ضروری ہیں:

الف: مغاضباً سے مراد کیا ہے؟ یونس کس پر غضبناک تھے؟

ب: جملہ "فظن ان لن نقدر علیہ" سے مراد کیا ہے؟

ج: "انی کنت من الظالمین" اس جملہ سے مراد کیا ہے؟

کیا مذکورہ تینوں تعبیریں حضرت یونس کے بارے میں ان کی عصمت سے ساز گار ہیں؟

جوابات:

الف: مغاضباً سے مراد حضرت یونسؑ کا غصہ قوم پر ہے، اس لئے کہ جو شخص سالہا اپنی قوم کو حق سعادت کے راستے کی دعوت دے اور صرف دو آدمی اس پر ایمان لائیں ایک عابد اور ایک عالم تو ایسی صورت میں قوم پر غضبناک ہونا ایک عام سی بات ہے اگرچہ انبیاء الٰہی معصوم ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بشری صفات سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے جہالت اور نادانی کی بنا پر یہ احتمال دیا ہے کہ "حضرت یونس اللہ پر غضبناک تھے کہ کیوں قوم پر عذاب نازل نہیں کیا؟"

ایسی تفسیر انبیاء الٰہی پر الزام اور ان کے بارے میں بدگمانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ب: جملہ "فظن ان لن نقدر علیہ سے مراد یہ ہے کہ یونس نے گمان کیا کہ ہم عرصہ حیات کو ان پر تنگ نہیں کریں گے، آیت میں نقدر کے معنی تنگ کرنے کے ہیں یعنی ضیق جیسا کہ اس آیت میں بھی ہے:

ومن قدر علیہ رزقہ۔۔۔الخ

اسی طرح اس آیت میں ہے:

ان ربک یبسط الرزق۔۔۔۔الخ

لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ یونس اس عالم میں کہ اپنی قوم پر غضبناک تھے قوم کو چھوڑ کر چل دئے اور یہ گمان کای کہ ہم ان پر زندگی کو تنگ نہیں کریں گے۔[123]

بعض حضرات نے لفظ نقدر کو قدرت کے معنی میں لیا ہے جو آیت کے قرائن کے خلاف ہے۔ یہاں نقدر ضیق کے معنی کے معنی میں ہے۔

اب یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ گمان یونس کے ذہن میں کیونکر آیا کہ اللہ نے ان پر زندگی کو تنگ نہیں کریگا؟

جواب:

۱۲۳۔ یہ تفسیر درواقع امام علی رضاؑ سے منقول ہے جب مامون نے اس آیت کے معنی آپ سے دریافت کئے۔ تفسیر نور الثقلین ج۳ص ۴۵۰

یونس نے جو کام انجام دیا تھا وہ یہ تھا کہ قوم کو جلدی دے چھوڑ کر چل دئے جبکہ بہتر یہ تھا کہ جہاں تک ممکن تھا قوم کے درمیان توقف اختیار کتے اور برابر انھیں حق وسعادت کی دعوت دیتے رہتے۔

لیکن یونس نے جلدی کی اور قوم کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے آگئے اور کشتی میں سوار ہوگئے۔

اس طرح سے قوم کو چھوڑنے کا مطلب عملاً یہ تھا کہ ان کا یہ عمل ان کی شان کے مطابق ہے گویا انہوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ بے اس عمل کی بناپر مجھ پر کوئی سختی نہیں کرے گا۔

دیگر الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ظاہری طور پر یہ گمان ان کے ذہن میں نہیں آیا تھا بلکہ ان کا طرز عمل اس گمان پر پوری طرح گواہی دے رہا تھا کہ گویا وہ یہ گمان کررہے ہیں کہ اللہ مجھ پر اس عمل کی بناپر کوئی سختی نہیں کرے گا۔

جس طرح خود اردو محاورات میں بھی اس قسم کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً اگر کوئی انسان بڑھاپے میں نہایت ہی مال وثروت کا حریص ہو تو کہا جاتا ہے کہ "یہ ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا چاہتا ہے اور اس کا مرنے کا ارادہ نہیں ہے"

ظاہر ہے کہ اہل محاورہ کی یہ مراد نہیں ہے کہ اس انسان کے ذہن میں واقعاً یہی بات ہے بلکہ یہ اس کا عمل ہے جو اس گمان کو مجسم کررہاہے۔

آیت میں حضرت یونس کے گمان کی بھی یہی حقیقت ہے:

کہ قوم کے علاقہ کو ناراض ہو کر اس طرح ترک کرنا انبیای الٰہی کی شان کے مطابق نہیں ہے انبیاء کو نمائندہ الٰہی ہونے کی بناپر اللہ کی رحمت ورافت کا مظہر ہونا چاہئے اور بندگان خدا کے ساتھ حتی الامکان نرمی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

لہٰذا یونس کا عمل مجسم طور پر گواہ تھا کہ گمان یہ ہے کہ اللہ کوئی سختی نہیں کرے گا ایسے عمل کو علماء کی اصطلاح میں ترک اولیٰ کہا جاتا ہے۔

ج: آیت میں حضرت یونس اپنا شمار ظالمین میں کررہے ہیں، ظالمین سے مراد کیا ہے؟

لغت عرب میں ظلم کے معنی ہیں "کسی شے کو اس کے مناسب مقام سے ہٹ کر رکھنا" مثلا کوئی انسان کسی کام کو انجام دے جس کا انجام نہ دینا مناسب ہو۔

اب اگر لوگوں کے جان ومال اور آبرو پر تجاوز کرنے کو ظلم کہا جاتا ہے عرفاً تو اس لئے ہے کہ یہ بھی ایک غیر مناسب عمل ہے جسے عرف عام میں ظلم وستم کہا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت یونس نمائندہ الٰہی تھے اور نمائندہ الٰہی کو رحمت ورافت کے خلاف راستہ نہیں اختیار کرنا چاہئے لہٰذا بہتر یہ تھا کہ وہ ابھی مزید قوم کے درمیان توقف کرںٰ لیکن اس کے برعکس انہوں نے قوم کو بغیر راہنما کے چھوڑا اور روانہ ہوگئے۔ گویا یہ عمل شان انبیاء سے مناسبت نہیں رکھتا تھا اگرچہ انہوں نے تبلیغ کا کام بہ حسن وخوبی انجام دیا تھا۔

لفظ ظالمین کی تفسیر میں دو احتمال ہے:

۱۔ اللہ نے سورہ قلم میں پیغمبر اسلامؐ کو یہ حکم دیا ہے کہ تقدیر الٰہی پر صبر ورضا کا مظاہرہ کریں۔

فاصبر لحکم ربک ولا تکن

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یونس کی ملامت کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے قوم کے مقابلے میں بھرپور صبر وبردباری کا مظاہرہ نہیں کیا اور قوم کی ہدایت سے مایوش ہوکر عذاب کی بددعا کردی۔

اس لئے اس آیت میں اللہ پیغمبر اسلامؐ کو صبر وبردباری کا حکمدے رہا ہے کہ کہیں آپ کا کاسہ صبر بھی لبریز ہوجائے اور اللہ سے امت کے لئے بددعا کردیں۔

یہ حقیقت آیت کے لفظ "اذ نادیٰ" سے واضح ہو رہی ہے یعنی یونس نے ہمیں پکارا عذاب نازل کرنے کے لئے درحالیکہ قوم پر غضبناک تھے۔[۱۲۴]

لہٰذا حضرت یونس کا ترک اولیٰ یہی تھا کہ قوم کے درمیان رہ کر مزید صبر کرنے کے بجائے انہوں نے اللہ سے عجلت کے ساتھ عذاب کی بددعا کردی۔ چنانچہ آیت میں ظلم سے مراد بے صبری اور برداشت کی قلت ہے۔

۲۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یونس کی ملامت کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو انہوں نے قوم کے حالات کی خبر لی اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ آیا ہوا عذاب واپس ہوگیا (اور شاید انہیں قوم کی توبہ اور ایمان لانے کی خبر نہ مل سکی) یہ خبر سن کر یونس غضبناک ہوئے اسی لئے پھر قوم میں اس وقت واپس نہیں آئے۔[۱۲۵]

گویا اس احتمال کی بناپر ظلم سے مراد یہی غضب اور قوم میں واپس نہ آنا ہے۔

بہرحال یونس کی ملامت ان تین چیزوں سے متعلق ہوسکتی ہے:

۱۔ قوم کو جلدی چھوڑ کر چل دینا اور مزید توقف نہ کرنا۔

۱۲۴۔ اس آیت میں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ندا سے مراد وہ ندا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: فنادیٰ فی الظلمات ان لا الہ الا انت بلکہ یہاں ندا سے مراد اللہ سے عذاب کی درخواست ہے جس کا چوبت جملہ وھو مکظوم ہے یعنی یونس قوم پر غضبناک تھے۔

۱۲۵۔ بحار الانوار ج ۱۴ ص ۴۰۰

۲۔ صبر یونس کا پیمانہ چھلک اٹھا اور قوم کے لئے عذاب کی بد دعا کر دی

۳۔ قوم کو چھوڑنے کے بعد قوم کی خبر لی اور عذاب کے ٹل جانے کی خبر سن کر قوم پر مزید غضبناک ہوئے اور سمندر کی طرف روانہ ہو گئے (اگر چہ قوم کے ایمان لانے اور توبہ سے باخبر نہیں ہوئے)

آیت میں ظلم کے یہی تین معانی ممکن ہیں

ان تینوں اسباب ملامت میں سے کوئی ایک بھی عمل حرام اور اللہ کی نہی مولوی کا مصداق نہیں ہے جو حضرت یونس کی عصمت کو زیر سوال لایا جائے اور منکرین عصمت کے لئے سند بن سکے بلکہ صرف ایک ترک اولیٰ ہے جو یونس سے سرزد ہوا ہے۔

آخری سوال ان آیات متعلق یہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یونس کے اس عمل کو ایسے غلام کے عمل سے تشبیہ دے رہا ہے جو اپنے آقا سے فرار کر کے آیا ہو (اور یہ خود عصمت کے خلاف ہے) جیسا کہ ارشاد ہے:

اذ ابق الی الفلک المشحون۔

جواب اباق لغت عرب میں غلام کے آقا سے فرار کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی نظر میں تو یونس کے عمل کی یہی حقیقت تھی اللہ نے انبیاء کی ذمہ داریوں کی عظمت کے پیش نظر حضرت یونس کے اس عمل کو غلام کے آقا سے فرار کرنے کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اور یہ ان کی مسئولیت کی اہمیت کی نشانی ہے خواہ لازمی ذمہ داری نہ ہو۔

منکرین عصمت اور پیغمبر اسلامؐ

یہاں تک متعدد انبیاء کے بارے میں ہم نے منکرین عصمت کے دلائل کی تحقیق کی اور یہ واضح ہو گیا کہ آیات کی تفسیر میں انہوں نے کس قدر دھوکہ کھایا ہے؟

ورنہ انبیاء الٰہی اپنی عظیم ذمہ داریوں کے پیش نظر، ہر قسم کے گناہ اور نقائص سے پاک وپاکیزہ ہیں۔

اب یہاں پر ضرورت ہے کہ منکرین عصمت نے جن آیات قرآنی کا سہارا لیکر خود پیغمبر اسلام کی عصمت کو نشانہ بنایا ہے ان آیات کی تحقیق اور تفسیر کا فریضہ انجام دیا جائے اور یہ بحث مکمل طور پر تفسیر موضوعی کے شائقین کے لئے ایک تحفہ قرار پاجائے۔

لیکن چونکہ ہم اس کتاب کی چھٹی اور ساتویں جلد میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں مکمل گفتگو قرآن کی روسے کریں گے اس لئے ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام کی عصمت سے متعلق آیات کا تفصیلی تذکرہ بھی انہیں جلدوں میں کیا جائے اور وہیں پر منرکین عصمت کے دلائل کا محکم جواب دیا جائے چونکہ ایک اعتبار سے امام کی عصمت بھی قرآن مجدی میں بیان ہوئی ہے اس لئے ہم اس موضوع سے مرتقل قرار دیے

ہیں اور جو آیات قرآن میں عصمت امام سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے صرف دو آیات کو عنوان قرار دیتے ہوئے ان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں وہ دو آیات یہ ہیں:

۱۔ آیہ ابتلاءاور آزمائش

۲۔ آیہ تطہیر

ان دونوں آیات کی تشریح و تفسیر کے بعد عصمت سے متعلق بظاہر تمام آیات کی تحقیق مکم ہو جائے گی سوائے ان آیات کے جن کا تعلق پیغمبر اسلام کی عصمت سے ہے۔

عصمت امام اور قرآن

مقدمہ

قرآن مجدی میں امام کا مفہوم اور اس کی عصمت کے دلائل علم کلام کے اہم مباحث میں شمار ہوتا ہے۔

علم کلام کی اصطلاح میں امام اسے کہتے ہیں جو پیغمبر کی وفات کے بعد امت امور کی باگ دوڑ سنبھالتا ہو

علماء میں امام کے بارے میں دو نظریے ہیں

ایک نظریہ یہ ہے کہ امام کا معصوم ہونا ضروری ہے

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ معصوم ہونا ضروری نہیں ہے صرف امت کے امور کو سنبھالنے کی صلاحیت کا ہونا کافی ہے۔

عصمت امام میں اختلاف کا راز

اس اختلاف کی بازگشت در حقیقت مفہوم امامت کی طرف ہے۔ کہ امام بھی نبوت کی طرح منصب الٰہی ہے بس امام وحی اور شریعت کا حامل نہیں ہے۔

یا ایک عرفی منصب ہے جو وزارت کی طرح سماج نے عطا کیا ہے

پہلی صورت میں امام کا معصوم ہونا ضروری ہے، جبکہ دوسرے نظیے کے مطابق ضروری نہیں ہے۔

اسی لئے ابکر باقلانی کی نگاہ میں امام کے لئے تین شرطین ہیں:

۱۔ قریش سے ہو

۲۔ ایک قاضی کے برابر علم رکھتا ہو

۳۔ دشمن کے دفاع کی صلاحیت کا مالک ہو

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اگر امام لوگوں پر ظلم کرے، ان کا مال غصب کرے، ناحق قتل کرے تو وہ اپنے عہدے سے معزول نہیں ہوگا بلکہ امت کو چاہئے کہ اس کو نصیحت کریں۔

علامہ تفتازانی کا کہنا ہے:

ایک امام کے مرنے کے بعد کوئی دوسرا اگر قہر و غلبہ سے امام بن جائے تو اس کی امامت نافذ ہے خواہ وہ فاسق یا جاہل ہی کیوں نہ ہو۔ بس اگر ناجائز کام کا حکم دے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔[1]

شیعہ اور منصب امامت

شیعہ نقطہ نظر سے امام منصب الٰہی ہے اور امام کا تقرر اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ نیز امام کا معصوم ہونا ضروری ہے

آیہ ابتلاء اور عصمت امام

آیات قرآن میں امام کے بارے میں سب سے روشن آیت یہ ہے:

واذا ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن

اس آیت کے ذیل میں حسب ذیل سوالات درپیش ہیں:

۱۔ کلمات سے مراد کیا ہے؟

۲۔ آزمائش کا مقصد کیا ہے؟

۳۔ کس طرح حضرت ابراھیم نے اس امتحان کو بخوابی پورا کیا؟

۴۔ امام اور عہدی سے مراد کیاہےَ؟

۵۔ امامت کا عہد الٰہی سے کیا تعلق ہے؟

۶۔ ظالم سے مراد آیت میں کیا ہے؟

۷۔ آیت سے امام کا معصوم ہونا کس طرح ثابت ہے؟

۱۔ کلمات سے مراد: لغت میں کلمہ وہ لفظ ہے جو کسی خاص معنی پر دلالت کرے، اس کی جمع کلمات ہے۔

مجازی طور پر خارجی اشیاء کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے اور مخلوقات جہان کو کلمات۔

۱۔ شرح مقاصد

آیت میں کلمات سے مراد کچھ اوامر اور دستوارات ہیں جن کے ذریعہ ابراھیم کا امتحان لیا گیا۔

اقوال مفسرین:

۱۔ مراد تحمل مقام امامت ہے۔[1]

اس قول کی رد یہ ہے کہ ابراھیم نے ان کلمات کو پورا کیا اور منصب امامت آزمون کے بعد دیا گیا لہٰذا کلمات سے مراد قطعاً خود منصب امامت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ حضرت ابراہیم کی دس سنتیں مراد ہیں: مضمضہ، استنشاق، شر کے بال منڈانا، مونچھوں کو کوتاہ کرنا، مسواک کرنا، ختنہ کرانا، زیر ناف بال مونڈنا، بغل کے بالوں کی صفائی، ناخن کاٹنا، پاخانہ کے مقام کو پانی دے دھونا

یہ تفسیر اگرچہ ابن عباس سے مروی ہے مگر پہلی تفسیر سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ اس لئے کہ کلمات سے مراد وہ سخت احکام ہیں جن کی تعملی سے منصب امامت کی صلاحیت کا تعین ہوتا ہے اور یہ دس احکام و سنن تو ایک عام دیندار انسان بھی آسان سے انجام دے لیتا ہے لہٰذا یہ امامت کے شرائط میں نہیں آسکتے۔

۳۔ مراد وہ تیس یا چالیس احکام ہیں جن کا ذکر قرآن کے مختلف سوروں میں ہوا ہے، مثلاً توبہ، عبادت، حمد خدا، السام، ایمان، نماز میں خشوع،، نماز کی پابندی اور لگویات سے پرہیز وغیرہ۔

یہ تفسیر بھی کمزور ہے اس لئے کہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ ابراہیم کا امتحان ان احکام سے ہوا ہو اور مذکورہ آیات میں حضرت ابراہیم کا کوئی نام بھی نہیں ہے۔

دوسری تفسیر کا ابن عباس کی طرف منسوب ہونا مشکوک ہے

کلمات کی صحیح تفسیر: مجموعہ داستان ہے:

۱۔ بت پرستوں کا مقابلہ کرنا کہ ایک دن سب عید گاہ پر چلے گئے اور حضرت ابراہم نے بت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ ڈالا اور ایک بڑے بت کو چھوڑ دیا۔

۲۔ حضرت ابراہیم کو نمرود کی عدالت نے یہ سزا دی کہ آگ میں پھینکا جائے چنانہ آپ کو آگ میں ڈالا گیا اور اللہ نے آپ کو نجات دی۔

۱۔ تفسیر فخر رازی

۳۔ حضرت ابراہیم نے اپنی جائے پیدائش (بابل) کو زندگی گزارنے کے لئے مناسب نہ سمجھا تو اپنی زوجہ سارہ کے ساتھ بت پرستوں کے شہر سے ہجرت کر گئے اور فلسطین میں مقیم ہو گئے۔

۴۔ حضرت ابراہیم اللہ کی جانب سے مامور ہوئے کہ اپنی زوجہ اور فرزند (حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل) کو بے آب و گیاہ سرزمین (مکہ) میں چھوڑ دیں۔

۵۔ ایک مدت کے بعد آپ مکہ واپس آئے تو دیکھا اسماعیل بڑے ہو گئے ہیں تو حکم خدا ہوا کہ اسماعیل کو ذبح کرو آپ نے بیٹے سے بیان کیا تو بیٹے نے بھی قبول کر لیا اس حکم کو انجام دے ہی رہے تھے کہ آواز قدرت آئی کہ تم نے خواب کو سچا کر دکھایا، اور اپنی ماموریت کو پورا کر دیا۔

قرآن نے سورہ صفات میں مذکورہ پانچوں واقعات کو اچھی طرح بیان کرنے کے بعد اور جب حضرت ابراہیم نے ان تمام سخت مراحل کو صبر کے ساتھ طے کر لیا تو کہا:

"ان ھذا لھو البلاء المبین؛ یہ ابراہیم کا ایک کھلا ہوا امتحان ہے"

لہٰذا کلمات سے مراد بھی یہ امتحانات خصوصاً فرزند کی قربانی کا امتحان ہے، جو سب سے بڑا امتحان ہے۔ اسی لئے لفظ (جمع) کلمات استعمال ہوا ہے۔

۲۔ اللہ بندوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے جبکہ وہ تمام حقائق سے باخبر ہے؟

امتحان کے دو مقصد ہوتے ہیں کبھی امتحان صلاحیتوں سے آگاہی کے لئے ہوتا ہے اور کبھی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے۔

اللہ بندوں کی آزمائش ان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے کرتا ہے جس سے خود بندوں کا تکامل مقصد ہوتا ہے۔

اس حقیقت کو نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

مقصد آزمائش یہ ہے کہ انسان کی فطری صلاحیتیں ظاہر ہو جائیں اور اس کے پوشیدہ کمالات کا ظہور ہو تا کہ اختیاری طور پر انسان ثواب یا عذاب کا حقدار ہو جائے۔[1]

لہٰذا اگر اللہ ابراہیم کو اسماعیل کے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا مقصد یہ جاننا نہیں ہے کہ ابراہیم کے اندر جذبہ اطاعت ہے یا نہیں؟ ابراہیم اطاعت کریں گے یا نہیں؟

۱۔ نہج البلاغہ کلمات قصار ۹۳

اس لئے کہ یہ بات تو اللہ جانتا ہی ہے بلکہ مقصد ای جذبہ اطاعت کو جو پہلے سے ابراہیم کی فطرت میں موجود ہے منزل استحکام تک پہونچانا ہے تا کہ ملکہ بن کر ان کے وجود میں راسخ ہو جائے۔

اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

ہم تمہارا امتحان لیں گے خوف، بھول، قلت مال اور قلت افراد نیز پھلوں کی قلت سے اور پیغمبرؐ! آپ ان تمام امتحانات میں صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے۔[1]

۳۔ جناب ابراہیمؑ نے اس امتحان کو کس طرح پورا کیا: فاتمھن ؟

اتمام، نقص کے مقابلہ میں پورا کرنے کے معنی میں ہے یعنی ابراہیم نے ان کلمات کو پورا کیا۔ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ ابراہیمؑ نے اس امتحان میں پورے پورے نمبر حاصل کئے اور مکمل کامیابی حاصل کی۔

نہ بتوں کو توڑنے میں ڈرے، نہ آگ میں دالے جانے سے گھبرائے نہ ہجرت اور غربت سے شکستہ خاطر ہوئے نہ بیوی اور بچوں کو بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑنا گراں گزرا یہاں تک کہ بیٹے کو قربان کرنا بھی عشق خدا میں جذبہ اطاعت کے لئے خوشگوار ہو گیا۔

ان تمام آزمائشوں میں کامیابی کا تمغہ خلت کی شکل میں اللہ نے ابراہیم کو دیا۔

لغت میں خلیل وہ ہوتا ہے جس کے پورے وجود میں اللہ کی محبت راسخ ہو جائے۔

۴۔ آیت میں لفظ امام سے مراد کیا ہے؟

پہلے لغت پھر استعمال قرآنی میں اس لفظ کی تشریح کی جارہی ہے:

ابن فارس کہتے ہیں: امام وہ ہے جس کی اقتدا کی جائے اور تمام امور میں اس کو مقدم کیا جائے یعنی پیشوا۔

اس بنا پر نبی، اماموں کے بھی پیشوا ہیں اور خلیفہ پیغمبر قوم کا پیشوا ہوتا ہے اور قرآن مسلمانوں کا پیشوا ہے۔[2]

اس وضاحت کی بنا پر معلوم ہوا ہے کہ امام اور پیشوا کا لفظ صرف انسانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اشیاء کے لئے بھی قابل استعمال ہے جیسے قرآن۔

ابن منظور کہتے ہیں: امام وہ ہوتا ہے جس کیا اقتدا کی جائے چاہے وہ رئیس ہو یا نہ ہو۔

۱۔ بقرہ آیت ۱۵۵

۲۔ معجم مقائیس اللغہ، ج ۱ ص ۲۸

اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر چیز کا امام اس کا ذمہ دار اور اسکے امور کی اصلاح کرنے والا ہوتا ہے لہٰذا قرآن مسلمانوں کا امام ہے۔[۱]

فیروز آبادی نے بھی قاموس محیط میں لسان العرب کے الفاظ کو نقل کیا ہے اور لفظ امام کی تشریح میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے ، پھر کہتے ہیں کہ امام مصادیق میں قرآن، پیغمبر، جانشین پیغمبر اور فوج کا کمانڈر سب شامل ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ جس آلہ سے مستری عمارت کی اونچائی کو ہموار کرتا ہے اسے بھی امام کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں مندرجہ ذیل چیزوں کو امام کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے:

۱۔ انسان جو کسی خاص گروہ کا پیشوا ہو جیسے اللہ نے ابراہیم سے کہا کہ ہم نے تمہیں لوگوں کا پیشوا بنایا۔

۲۔ کتاب: قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت کے عنوان سے نازل کی گئی۔[۲]

۳۔ راستہ: ہم نے قوم لوط اور اصحاب الایکہ سے انتقام لیا اور ان دونوں قوموں کی آبادیاں جو ویران ہو چکی ہیں کشادہ تاستہ پر تھیں۔[۳]

اس آیت میں راستہ کو امام اس لئے کہا گیا ہے کہ مسافر منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے راستہ ہی کا اتباع اور قصد کرتا ہے جہاں راستہ ختم ہو جاتا ہے مسافر بھی ٹھہر جاتا ہے۔

۴۔ لوح محفوظ: ہم نے ہر چیز کو روشن امام میں منحصر کر دیا ہے۔

لوح محفوظ کو قرآن میں کتاب سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ لوح محفوظ کو کتاب کے تحت مانا جائے۔

اب مفسرین کے اقوال میں یہ دیکھنا ہے کہ آیت میں جعل امامت سے مراد کیا ہے:

الف: امامت سے مراد نبوت ہے

اس نظریہ کو فخر رازی اور شیخ محمد عبدہ نے اختیار کیا ہے لیکن یہ نظریہ اس لئے باطل ہے کہ آیت میں حضرت ابراہیم کی ذریت کا بھی ذکر ہے اور یہ بات قرآن سے چاب ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو بڑھاپے میں صاحب اولاد بنایا تھا اور یہ بھی ثابت ہے کہ اولاد کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیم پر وحی نازل ہوتی تھی اور وحی ہی وہ شی ہے جس سے نبوت کا اثبات ہوتا ہے۔

خود حضرت ابراہیم کو وحی کے ذریعہ ہی اولاد کی ولادت کی بشارت دی گئی تھی۔

۱۔ لسان العرب، ج۱۲ص۲۴

۲۔ سورہ ہود آیت ۱۷

۳۔ حجر ۷۹

لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم اس سے پہلے ہی نبوت کے تاجدار تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت میں امامت کی تفسیر نبوت سے کرنا محض حضرت ابراہیم کی زندگی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

ب: امامت سے مراد قول و فعل میں نمونہ کے ہیں

نبوت سے مراد وحی کا حاصل کرنا اور رسالت سے مراد اس وحی کا پہونچانا ہے یعنی تبلیغ کرنا۔ خود وحی کے حصول کے لئے ہی انسان کا قولاً و عملاً نمونہ ہونا ضروری ہے۔

لہٰذا نمونہ ہونا بھی آیت میں امامت سے مراد نہیں ہو سکتا بلکہ نمونہ ہونا امامت سے پہلے نبوت کے دوران ہی حاصل ہے اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے:

اللہ نے ابراہیم کو نبی بنانے سے پہلے اپنا بندہ بنایا، رسول بنانے سے پہلے نبی بنایا، خلیل بنانے سے پہلے رسول بنایا، امام بنانے سے پہلے خلیل بنایا اور ان کے اندر تمام صفات یکجا ہو گئے تب انہیں امامت کے درجہ پر فائز کیا۔[۱]

ج: نظریہ علامہ طباطبائی:

امام اس بلندی ہستی کو کہتے ہیں جس میں رہبری کی صلاحیت ہو اور اللہ کی طرف انسانیت کے قافلہ کی ہدایت کر سکتا ہو۔

علامہ طباطبائی لکھتے ہیں کہ امامت سے مراد آیت میں نبوت وخلافت ووصایت اور دین و دنیا کے امور میں ریاست یا لائق اطاعت ہونا صحیح تفسیر نہیں ہے اس لئے کہ یہ ساری باتیں تو نبوت کا بھی لازمہ ہیں، ان تمام صفات کا امامت سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ انبیاء اور مرسلین کی ہدایت صرف راستہ دکھانا ہے اور امام کی ہدایت قافلہ بشریت کو منزل مقصود تک پہونچانا ہے۔

امام کی مثال خورشید سے دی جاسکتی ہے کہ خورشید اپنی شعاعوں سے نباتات کی پرورش کرتا ہے اسی طرح امام بھی اپنے نفوذ سے آمادہ دلوں کو پورے طور پر منقلب کر دیتا ہے۔

امامت کے عہدہ پر بغیر امتحانات کے انسان فائز نہیں ہو سکتا جس طرح ابراہیم بھی قربانی اور دیگر امتحانات کے بعد ہی فائز ہوئے۔

امامت پیغمبر اسلامؐ:

پیغمبر اسلامؐ نبوت اور رسالت کے علاوہ امامت کے عہدے پر بھی فائز تھے، اس لئے کہ آپ کی ذات حضرت ابراہیم سے افضل ہے اور جب حضرت ابراہیمؑ نبوت کے عہدے پر فائز تھے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ پیغمبر اسلامؐ اس عہدے پر فائز ہوئے بغیر ان سے افضل ہو جائیں۔

۱۔ اصول کافی، ج ۱ باب طبقات الانبیاء ص ۱۷۵

اولویت پیغمبر اسلامؐ

یہ آیت: "النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم"[۱]

ثابت کر رہی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مومنین پر خود ان سے زیادہ حکومت کے مالک ہیں اور یہی مفہوم امامت ہے اور یہ امامت وہ حکومت ہے جو اللہ نے پیغمبرؐ کو دی ہے اور پیغمبرؐ اس حکومت کو بشریت کی سعادت میں ہی استعمال کر سکتے ہیں۔

اطاعت پیغمبرؐ:

قرآن میں بیس سے زیادہ مقامات پر رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ رسول کی اطاعت سے مراد کیا ہے؟

قرآنکی متعدد آیات میں اطاعت رسول سے، اطاعت خدا کے بعد مستقل حیثیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس سے اللہ کی اطاعت کی طر فرہدایت ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خود رسول صاحب امر و نہی ہیں اور رسول کا صاحب امر و نہی ہونا اس لئے ہے کہ اللہ نے انہیں رسالت کے منصب سے سر فراز کیا ہے۔

امامت دین کے راہنماؤں کی اصطلاح میں:

۱۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: امامت امت کے امور کا نظام ہے اور اامام کی اطاعت اس کی تعظیم کا مظہر ہے

۲۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: حکومت سے پرہیز کرو اس لئے کہ حکومت امام عادل کا حق ہے جو قضاو قدر کا علم رکھا ہے۔[۲]

۳۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: بیشک امامت دین کی لگام ہے اور مسلمانوں کے امور کا نظام ہے اسی میں دنیا کی بھلائی ہے اور اہل ایمان کی عزت ہے۔[۳]

چند نکات

۱۔ احادیث میں امام کا مفہوم:

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا

۱۔ احزاب ٦

۲۔ وسائل الشیعہ ج۱۸ ص۷

۳۔ کافی، ج۱ ص۲۰۰ (کتاب الحجۃ)

جو شخص بھی مر جائے اور زندگی میں اپنے وقت کے امام کی معرفت نہ رکھتا ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے جو کفر اور گمراہی کی موت ہے۔

۲۔ امامت کا سبب صرف امتحان اور آزمائش ہی نہیں ہے

اختبار اور امتحانات اگرچہ انسان کی ترقی کا سبب بنتے ہیں جس سے انسان میں پوشیدہ استعداد کھل کر سامنے آتی ہے پھر انسان اللہ کی جانب سے فیضان امامت کا حقدار ہوتا ہے۔

لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہمیشہ انسان مصائب کے مرحلہ سے گزر کر ہی اس لائق ہو کہ امام بن سکے بلکہ ممکن ہے کہ مصائب کے بجائے دیگر اسباب نے انسان کو اس عہدہ امامت کے لائق بنایا ہو اور ان اسباب میں ممکن ہے کہ وراثت ہو، سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے اندر کمالات اور فضائل انسانی کو حاصل کرنے کی صلاحیت اور استعداد اسکے بزرگوں سے وارثت میں منتقل ہوتی ہے۔

جن خاندانوں میں اللہ کے نبی اور رسول پیدا ہوتے تھے ان میں عام طور سے پاکیزگی اصالت اور صفائے قلب پائی جاتی تھیاور یہ کمالات ان میں نسل کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتے تھے جس طرح رسول اسلامؐ عرب کے سب سے اچھے خاندان قریش میں پیدا ہوئے اور قریش میں بھی شریف ترین خاندان بنی ہاشم میں پیدا ہوئے یہ خاندان تمام فضائل انسانی میں اس وقت بھی پورے جزیرۃ العرب میں نمایاں حیثیت کا مالک تھا اسی طرح تربیت بھی انسانی کمالات کے منتقل ہونے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

کبھی کبھی کچھ غیر معلوم اسباب بھی اس عہدہ امامت میں دخیل ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی اللہ کا مخصوص عطیہ ہوتا ہے کہ کسی فرد بشر کو عہدہ امامت سے سرفراز کر دے۔

آیت تطہیر اور اہل بیت کی عصمت

سورہ احزاب کی آیت ۳۳ کا ایک ٹکڑا آیت تطہیر کہلا تا ہے جو یہ ہے:

انمایرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا

بیشک اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تم اہل بیت سے ہر طرح کی کثافت کو دور رکھے اور تمہیں پر اعتبار سے پاک وپاکیزہ رکھے

تفسیر: شیعہ علماء اور متکلمین نے اہل بیت اطہار کی عصمت کے ثبوت میں ہمیشہ اس آیت کو پیش کیا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ آیت میں اہل بیت سے مراد کون ہے؟

اور کس طرح یہ آیت اہل بیت کی عصمت کو ثابت کرتی ہے؟

اس آیت کی عصمت اہل بیت پر دلالت کی بنیاد مندرجہ ذیل چیزیں ہیں:

۱۔ رجس سے مراد ہر قسم کا گناہ ہے خواہ وہ کفر وشرک ہو یا گناہ کبیرہ یا گناہ صغیرہ۔

۲۔ آیت میں ارادہ سے مراد اللہ کا تشریعی ارادہ نہیں ہے بلکہ تکوینی ارادہ ہے یعنی اللہ خود رجس کو دور کرے گا نہ یہ کہ رجس سے دوری اک مطالبہ خود اہل بیت سے کرے گا کہ وہ ہر گناہ سے دور رہیں۔

۳۔ اہل بیت کے مصادیق کا تعین آیت کے نزول کے موقع پر اور اس سے پہلے خود لفظ اہل بیت کے مفہوم کے صحیح تشخیص

این تین مراحل کے طے ہونے کے بعد اہل بیت کی عصمت مطلقہ آیت سے ثابت ہو جاتی ہے۔

اب مذکورہ تینوں مراحل کے بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں:

۱۔ رجس سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟

مشہور لغت دان ابن فارس کی نگاہ میں رجس کی معنی قذر یعنی کثافت کے ہیں۔[1]

۱۔ معجم مقائیس اللغہ، ج ۲ ص ۴۹

قرآن میں یہ لفظ کم سے کم آٹھ بار آیا ہے اور مردار، کون، سور کا گوشت، شراب، جوا، بت اور کافران تمام چیزوں کو رجس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا رجس سے مراد کثافت ہے خواہ مادی اور ظاہری ہو جیسے خون یا مردار یا معنوی اور باطنی ہو جیسے بت، جوا اور کافر کہ ان کی نجاست معنوی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آیت تطہیر میں رجس سے مراد ظاہری کثافت نہیں ہے بلکہ معنوی کثافت ہے جو کافر اور عاصی ہو انسان میں پائی جاتی ہے اور وہ کثافت صرف کفر و شرک اور گناہوں کی کثافت ہے اور جو انسان اس کثافت سے دور ہو وہی معصوم ہے اگرچہ تطہیر اور طہارت کے بھی درجات ہیں اور تمام درجات عصمت کے مرادف نہیں ہیں جیسا کہ مسجد قبا میں نماز پڑھنے والوں کے لئے قرآن نے کہا کہ:

فیہ رجال یحبون ان یتطھروا واللہ یحب المطھرین۔[1]

لیکن آیت تطہیر میں رجس کی الف ولام استغراق جنس کے ساتھ نفی کرنا اور پھر متعدد الفاظ تاکید کے ذریعہ اس طہارت پر زور دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طہارت عام طہارتوں سے بالاتر ہے اور اسی کا نام عصمت ہے۔

اس بات سے ان مفسرین کی رد ہو جاتی ہے جو قائل ہیں کہ صرف شرک اور گناہان کبیرہ کی نفی مراد ہے بلکہ آیت میں الف لام کے ذریعہ بہ طور مطلق جنس رجس کی نفی کی گئی ہے۔

۲۔ آیت میں ارادہ تکوینی مراد ہے نہ کہ تشریعی ارادہ آیت میں ارادہ کا تعلق خود اللہ کے فعل سے ہے نہ کہ بندے کے عمل سے اور یہی دلیل ہے کہ تکوینی ارادہ مراد ہے نہ کہ تشریعی۔

دوسرے یہ کہ بندوں کی گناہوں سے دوری اور پاکیزگی تو اللہ کے تشریعی ارادہ سے رابستہ ہے جو صرف اہل بیت سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام بندوں سے اللہ کے تشریعی ارادہ کی روشنی میں مطلوب ہے اور اسی ارادہ کی بنا پر اللہ نے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ قائم کیا اسی لئے اللہ نے جب وضو کا حکم دیا تو اپنے تشریعی ارادہ کا اعلان کرتے ہوئے نماز گزاروں کی طہارت کا مطالبہ کیا اور گویا اس طہارت کو وضو کا فلسفہ قرار دیا۔

لیکن آیت تطہیر میں طہارت کا تعلق ایک مخصوص گروہ یعنی اہل بیت سے ہے لہٰذا اسے تشریعی ارادہ پر حمل نہیں کیا جا سکتا جس کا تعلق تمام بندوں سے ہے بلکہ یہ ایک تکوینی ارادہ ہے۔

اگرچہ خود تشریعی ارادہ کا تعلق بھی تمام بندوں کے ساتھ ساتھ اہل بیت سے بھی ہے، لیکن ایک تکوینی ارادہ بھی اہل بیت سے مخصوصہے جو ان کی عصمت کا ثبوت ہے اور دیگر بندوں سے اس کا تعلق نہیں ہے اور اس بات کا ثبوت خود آیت کے الفاظ ہیں کہ اگر انسان دقت کرے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آیت میں تکوینی ارادہ مراد ہے جو صرف اہل بیت کی طہارت سے مخصوص ہے۔

۱۔ توبہ آیت ۱۰۸

آیت کے وہ قرائن حسب ذیل ہیں:

۱۔ آیت میں لفظ انما آیاہے جو اس ارادہ وک اہل بیت سے مخصوص کر رہاہے اور انما حصر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ لفظ اہل بیت آیت میں آیاہے اور اعراب کے لحاظ سے منصوب ہے اور اس کی منصوبیت کا سبب حروف ندا کا پوشیدہ ہونا یا جملہ اخصکم کا پوشیدہ ہوناہے جو نحو کے باب اختصاص میں بیان کای گیاہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تمہیں کہہ رہے ہیں نہ کہ دوسروں کو۔

۳۔ جبکہ ارادہ کا تعلق بیان کر دیا گیا کہ مقصد رجس کو دور کرناہے لیکن پھر بھی اس کی تاکید کی گئی کہ اللہ تمہیں پاک وپاکیزہ رکھنا چاہتاہے۔

۴۔ حد یہ ہے کہ اس تاکید پر بھی اکتفانہ کی گئی بلکہ خود تاکید کی تاکید کے لئے تطہیراً کی شکل میں مفعول مطلق تاکیدی بھی آگیا۔

۵۔ پھر تطہیراًکو بھی نکرہ لایا گیا جس کی تنوین تنکیر اس طہارت کی عظمت کا اعلان کرے اور ایسی ہی عظیم طہارت عصمت کا درجہ رکھتی ہے۔

آخر میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں حصر کے لئے بھی دو لفظ ہیں ایک انما اور دوسرے عنکم کے بعد اھل بیت کا آنا جو باب اختصاص یا ھرف ندا کی بناپر حصر کی نشانی ہے اور باب اختصاص کے فعل یا حرف یاندا کے پوشیدہ ہونے کی بناپر منصوب ہے ان دونوں انحصار کا مفہوم یہی ہے کہ طہارت کا یہ درجہ صرف اہل بیت سے مخصوص ہے اور یہی عصمت ہے جو اللہ کے تشریعی ارادہ کے بجائے تکوینی ارادہ سے وابستہ ہے۔

دونوں ارادوں کی خصوصیت:

ارادہ تکوینی اور رادہ تشریعی کا ضابطہ کیاہے؟

اس سلسلے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ ارادہ تشریعی کا نتیجہ یہ ہے کہ عمل ارادہ کرنے والے کے بجائے بندے سے صادر ہو، جبکہ ارادہ تکوینی میں صدور عمل خود مرید سے ہوناہے اور وہ مرید خداہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تکوینی ارادہ میں مراد کا جداہونا ارادہ سے ممکن نہیں ہے جبکہ تشریعی ارادہ میں یہ امکان پایاجاتا ہے ہے لہٰذا اللہ کے تکوینی ارادہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کا ارادہ کبھی بھی مراد سے جدا نہیں ہوسکتا اور ہر حال میں حاصل ہو کر ہی رہے گا۔ اس لئے کہ مراد کا حصول وہاں ناممکن ہوجاتاہے جہاں فاعل کی قدرت اور ارادہ میں سستی پائی جاتی ہے لیکن جہاں مرید خداہو اور رادہ تکوینی ہو اور قدرت اور ارادہ کی طاقت کامل ہو وہاں مراد اور ارادہ میں جدائی ناممکن ہے جبکہ ارادہ کا تعلق محال عقلی سے نہ ہو۔

لہٰذا آیت تطہیر میں اللہ کا تکوینی ارادہ اہل بیت کی عصمت سے متعلق ہواہے جو ہر حال میں قابل حصول ہے۔

اب چند سوالات در پیش ہیں:

الف: جب ہر حال میں اللہ کا یہ ارادہ حاصل ہو کر ہی رہے گا تو گویا اہل بیت کی عصمت حتمی اور قطعی امر ہے اور ایسی صورت میں اہل بیت نیکیوں کے انجام دینے اور گناہوں کے ترک کرنے پر مجبور ہوں گے اور گناہوں کے انجام دینے پر اصلاً قادر ہی نہیں ہوں گے اور ایسی عصمت ان کے اختیار اور آزادی کے خلاف ہو گی جبکہ عصمت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ معصوم عصمت کے ساتھ ساتھ گناہوں کے انجام دینے پر بھی قادر ہے اگرچہ انجام نہیں دیتا۔

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آیت میں ارادہ خدا تشریعی ہے نہ کہ تکوینی۔

جواب: اللہ کے تکوینی رادہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان کی قدرت ہی عمل کے بہ نسبت سلب ہو جائے اور وہ مراد خدا سے ہٹ کر انجام ہی نہ دے دکے۔

بلکہ عصمت سے مراد علم و معرفت کا عظیم درجہ ہے جس کی روشنی میں انسان گناہوں پر قدرت رکھتے ہوئے بھی ان کی طرف قدم نہیں بڑھاتا اور گویا اسے گناہوں کے انجام کا قطعی علم و عرفان ہوتا ہے اور در حقیقت یہی عرفان اللہ کا عطیہ ہے جو سبب عصمت ہے۔

شیخ مفید نے عصمت کو رسی سے تعبیر کیا ہے جو اللہ نے ڈوبتے ہوئے انسان کو عطا کی ہے کہ وہ اس کے سہارے سے نجات حاصل کر لے مگر پھر بھی وہ مختار ہے اگر چاہے تو رسی کو چھوڑ کر غرق ہو جائے، لہٰذا صرف رسی کا عطا کرنا اسے نجات دینا نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ شخص خود رسی کا سہارا لے اور ہمت کر کے خود بھی نجات کی کوشش کرے۔ لہٰذا عصمت سے مراد جو الزامی طور سے اللہ کی جانب سے انسان کو عطا کی جاتی ہے وہ حالت نفسانی ہے جو انسان کی قدرت اور اختیار کے دائرہ میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور وہ اثر گناہوں سے حفاظت ہے مثال کے طور پر کوئی بھی عقلمند انسان چند پیسوں کی خاطر اپنی آبرو کو ہاتھ دینے پر آمادہ نہیں ہے بلکہ گدائی کے بہ نسبت ہر عقلمند انسان معصوم ہے اگرچہ وہ اس کام سے عاجز نہیں ہے۔

ب: دوسرا سوال یہ ہے کہ جب عصمت انسان کا کسی کمال نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے بغیر مانگے اور بغیر کوشش کے عطا کردہ ہے تو پھر یاسا کمال قابل تعریف نہیں ہو سکتا۔

تعریف اس کمال کی کی جاتی ہے جو انسان نے خود اپنی کوشش سے حاصل کیا ہو؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ بھی یہ کمال ہر کس و ناکس کو عطا نہیں کرتا ہے بلکہ پہلے سے خود انسان میں اس کمال کے لینے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اور وہ صلاحیت کبھی موروثی ہوتی ہے اور کبھی خود معصوم اپنی زندگی میں اپنی کوشش سے اس صلاحیت کو اپنے وجود میں ایجاد کرتا ہے، اس بنا پر عصمت عطائی ہو کر بھی قابل تعریف و کمال ہے۔

ج: تیسرا سوال یہ ہے کہ عصمت معصوم اللہ کا ارادہ ہے جو بنص آیت آنے والے زمانے میں تحقق پذیر ہو گا۔

اس لئے کہ آیت میں ماضی کے بجائے مضارع کا لفظ ہے (یرید) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا یہ ارادہ آنے والے زمانے سے متعلق ہے نہ کہ گزشتہ زمانے سے اور اس کا نتیجہ صرف امکان عصمت ہے آنے والے زمانے میں ورنہ آیت میں عصمت کے واقع ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ہے؟

اگر عصمت کا وقوع مراد خدا ہوتا تو لفظ مضارع کے بجائے ماضی (اراد) کا استعمال ہوتا۔[1]

جواب: اس اعتراض کی بنیاد در حقیقت خاندان رسالت کے ساتھ بے انصافی پر قائم ہے ورنہ قرآن میں یہی لفظ مضارع متعدد مقامات پر آیا ہے مگر وہاں یہ اعتراض کوئی نہیں کرتا مثلاً شیطان کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے یرید مگر کسی کو اعتراض نہیں،

اسی طرح دیگر مقامات پر خود اللہ کے لئے بھی یہی لفظ یرید آیا ہے مگر چونکہ وہ آیات اہل بیت رسول سے متعلق نہیں ہیں اس لئے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے اسکے علاوہ یہ کہ اگر مراد آیت تطہیر صرف اماکن کو بیان کرنا ہو تو اس امکان میں تو دوسرے لوگ بھی شریک ہیں یہ امکان اہل سے تو مخصوص نہیں ہے۔

د: موجودہ رجس برطرف ہوے۔

آیت تطہیر کے الفاظ کے مطابق اگر آیت کے نزول کے بعد اہ لبیت کثافت سے پاکیزہ ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کثافت پائی جاتی تھی اور یہ بات شیعوں کے عقیدہ کے کالف ہے اس لئے کہ شیعوں نے اہل بیت کو ہر زمانے میں معصوم مانا ہے۔

جواب: اس اعتراض کا جواب تو واضح ہے اس لئے کہ تطہیر کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ پہلے سے کثافت اور آلودگی پائی جاتی ہو اور پھر اسے برطرف کر دیا جائے بلکہ امکان کثافت کے ہوتے ہوئے بھی تطہیر کا مفہوم پایا جات ہے چاہے خود کثافت پائی جاتی ہو یا نہین اور شیعہ اہل بیت کے بارے میں امکان کثافت کے منکر نہیں ہیں صرف اس کے وقوع کے منکر ہیں۔

٣۔ لفظ **اہل بیت کا مفہوم** کیا ہے؟

لفظ اہل بیت میں دو لفظ ہیں اہل اور بیت اور یہ دونوں لفظ مل جل کر پورے قران میں دو جگہ پر آئے ہیں ایک یہی آیت تطہیر ہے اور دوسرے سورہ ہود آیت ٧٣ میں حضرت سارہ کے بارے میں ہے: اللہ کی رحمت اور برکات تم اہل بیت پر ہیں

لغت کے اعتبار سے اہل اور بیت دونوں کے معانی واضح ہیں ابن منظور کہتے ہیں: اہل الرجل اخص الناس بہ

کسی بھی انسان کے اہل وہ ہیں جو لوگوں میں سب سے زیادہ قریبی نسبت رکھتے ہیں اس انسان سے۔

لغت عرب اور قرآن کی متعدد آیات کی روشنی میں انسان کی بیویاں بھی اس کے اہل بیت میں شمار ہوتی ہیں

١۔ الصراط المستقیم ج١ ص١٨۴ (زین الدین بیاضی) مخالفین سے نقل کرتے ہوئے

لفظ اہل بیت کا مصداق:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر آیت کے اندر یا بہر کوئی دلیل اہل بیت کے مصادیق کے انحصار کو بیان نہ کرے تو ضروری ہے کہ لغت عرب اور قرآن کی متعدد آیات کی روشنی میں تمام افراد پیغمبر کے اہل بیت میں شمار ہوں گے جن کا کسی بھی قسم کا (حسبی نسبی) رشتہ پیغمبر سے پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر قرائن آیت اور احادیث پیغمبر کے اشارات کسی ایک خاص گروہ سے اس عنوان کو انہیں افراد میں محدود کر دیا جائے اور وہ قرائن حسب ذیل ہیں جن کی مدد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مخصوص گورہ کے علاوہ سب اس عنوان سے باہر ہیں چاہے ازواج ہوں یا پیغمبر کے دیگر رشتہ دار۔

الف: آیت میں بیت سے مراد مخصوص گھر ہے نہ کہ ہر گھر یا متعدد گھر، پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ البیت کا الف لام کون سا ہے، الف لام استغراق جنس ہے یا عہد؟

طاہر ہے کہ جنس کی شمولیت مراد نہیں ہے بلکہ عہد مراد ہے ورنہ لفظ اہل البیوت ہوتا نہ کہ اہل البیت چونکہ اس سے پہلے ازواج کے ذیل میں جمع کا لفظ آیا ہے: و قرن فی بیو تکن

لہٰذا بیت سے وہ مخصوص گھر مراد ہے جو صرف متکلم اور مخاطب کے ذہن میں ہے اور وہ مخصوص گھر صرف حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ کا گھر۔ جسے تمام مفسرین کی نگاہ میں اجماعی طور پر آیت شامل ہے۔

اس لئے کہ اس شمولیت کا صرف خوارج کے دو آدمیوں نے انکار کیا ہے عکرمہ اور مقاتل باقی کسی محدث یا مفسر نے اس شمولیت کا انکار نہیں کیا ہے اگر اختلاف ہے تو دیگر افراد کی شمولیت میں ہے اور چونکہ آیت میں ایک ہی گھر کا ذکر ہے تو بس وہ گھر علیؑ و فاطمہؑ کا گھر ہے اور بس۔

اگر لفظ بیت میں دیگر لوگوں کے گھروں کو بھی شامل کر لیا جائے مثلاً ازواج کے گھروں کو تو پھر الف ولام کی عہد بت باطل ہو جائے گی جس طرح اتفاق مفسیرن و محدثین کو نقصان پہونچے گا۔

ب: آیت میں بیت سے مراد مٹی کا گھر نہیں ہے۔

ہماری گزشتہ دلیل کی بنیاد یہ تھی کہ بیت سے مراد اینٹوں اور متی کا گھر ہے لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصلاً بیت سے متی کا گھر مراد نہیں ہے بلکہ نبوت اور وحی کا گھر مراد ہے جو ایک مادی گھر ہونے کے بجائے معنوی گھر ہے جسے مجازی طور پر گھر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ورنہ مادی گھر کا ذکر جمع کے لفظ میں اسی آیت کے شروع میں آیا ہے جہاں ازواج کے الگ الگ کمروں کو گھر سے تعبیر کیا ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ اس معنوی گھر والے ایسے ہوں جو طہارت اور علم کے لحاظ سے اس معنوی گھر کے اہل کہہ جا سکیں، لہٰذا یہاں صرف مادی رشتہ کافی نہیں ہیں بلکہ ایک معنوی عظیم رشتہ بھی ضروری ہے جو صرف چند افراد میں محدود ہے ورنہ حسب و نسب کے رشتہ داروں میں پیغمبرؐ کے مخالفین بھی موجود ہیں۔

اسی لئے سورہ ہود کی آیت ۷۳ کی تفسیر میں زمخشری نے کہا کہ حضرت سارہ کو حضرت ابراہیم کے اہل بیت میں اسی لئے شمار کیا ہے کہ وہ ابراہیم کے گھر میں رہتی تھیں جہاں وحی نازل ہوتی تھی گویا بیت سے مراد بیت نزول وحی ہے۔[۱]

لہٰذا آیت تطہیر میں بھی بیت سے مراد خانہ وحی و نبوت ہے اور یا سے گھر والے (اہل بیت) وہی ہو سکتے ہیں جو ایسے گھر سے پوری طرح ہماھنگی رکھتے ہوں اور صرف حسب نسب کے لحاظ سے رشتہ دار ہوا کافی نہیں ہے جب تک فکری اور روحی لحاظ سے صاحب کانہ (پیغمر ب) سے مناسبت نہ پائی جاتی ہو۔

یہ احتمال اگر آیت کے نزول کے موقع پر قطعی نہ بھی ہو تو نزول کے بعد زمانہ کے ساتھ ساتھ لفظ اہل بیت، بیت بیت نبوت کے معنی سے مخصوص ہو کر رہ جائے گا، پھر اس لفظ سے مذکورہ معنی کے علاوہ دوسرے معنی ذہن بشر میں نہیں آئیں گے اور آج ایسا ہی ہے۔

ج: آیت میں ضمیروں کا مذکر آنا

سورہ احزاب کی آیت ۲۹ سے ۳۷ تک وازواج پیغمبر کے لئے کم سے کم بیس ضمیریں مونث کی آئی ہیں جو ادبی قواعد کے مطابق ہے لیکن اس درمیان آیت تطہیر میں ضمیریں مذکر کی آئی ہیں اور مخاطب اہل بیت ہیں۔

ضمیروں کی اس تبدیلی کا راز سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ دونوں کا مخاطب الگ الگ ہے۔ چاہے پہلے کی آیات ازواج کے بارے مین ہوں لیکن مذکر کی ضمیروں والی آیات کا تعلق ازواج کے بجائے اہل بیت سے ہے۔

اب ایسا کیوں ہوا کہ ازواج کے تذکرے کے دوروان اہل بیت کا تذکرہ آگیا اور پھر دوبارہ روئے سخن ازواج کی جانب منتقل ہو گیا؟

اس سوال کا جواب بعد میں دیا جائے گا

زبان پیغمبرؐ سے اہل بیت کے مصادیق کا تعین:

اس بارے میں پیغمبرؐ سے بہ کثرت روایات نقل ہوئی ہیں اور مسئلہ واضح ہو گیا ہے، چنانچہ طبری نے اپنی تفسیر میں سترہ حدیث اور جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب در منثور میں چودہ حدیث نقل کی ہیں اور ان تمام روایات کا سلسلہ اصحاب و تابعین تک پہونچتا ہے اور ان میں سے بہت سی

۱۔ کشاف ج ۲ ص ۱۷

احادیث کو صحیح کا درجہ دیا گیاہے اور کثرت طرق کی بناپر ان احادیث کی سند کی تحقیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور تمام مفسرین اور محدثین و مورخین نے ان رویات کو ہمیشہ نقل کیاہے اور قبول کیاہے۔

ان احادیث سے یہ ثابت ہو تاہے جبکہ اہل بیت سے مراد اس آیت میں صرف خمسہ طیبہ ہیں یعنی پیغمبر اسلامؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ زہراؑاور امام حسنؑ وامام حسینؑ۔

اگرچہ ان تمام احادیث کے خلاف دو حدیثیں اور بھی نقل کی گئی ہیں جن کی تحقیق بعد میں کی جائے گی جن صحابہ اور تابعین سے یہ احادیث نقل کی گئی ہیں ان کے نام ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ان سترہ احادیث کو مندرجہ ذیل افراد نقل کیاہے:

ابوسعید خدری، انس بن مالک، ابواسحاق، واثلہ، ابوہریرہ، ابوالحمراء، سعد بن ابی وقاص، علی بن حسین، عائشہ، ام سلمہ وغیرہ ان میں سے چھ احادیث کی سند حضرت ام سلمہ تک پہونچتی ہے۔

جلال الدین سیوطی نے در منثور میں ان چودہ احادیث کو گذشتہ افراد کے علاوہ ابن عباس سے بھی نقل کیاہے اور ان تمام روایات سے آیت تطہیر کے مفہوم کا خمسہ نجباء میں انحصار ثابت ہو تاہے، اب کیایہ ممکن ہے کہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ان تمام صحیح السند روایت سے چشم پوشی کرلی جائے؟

ان کثیر روایات کا عشر عشیر بھی اگر کسی اور کی شان میں ہو تاتو تمام مسلمان شدومد کے ساتھ اس سے تمسک کرتے اور آیت کا ابہام دور ہو جاتایہ ناانصافی صرف خاندان رسالت کے ساتھ ہی ہمیں ہر منزل پر دکھائی دیتی ہے۔

جبکہ اگر ان رویات کے ساتھ ساتھ ان رویات کو بھی مد نظر قرار دیاجائے جو شیعہ محدثین نے اپنی کتابوں میں پیغمبرؐیاائمہؑ سے نقل کی ہیں توپھر مسئلہ میں بحث کرناصرف کٹ حجتی ہو گااور کٹ حجتی کے اسلحہ کا استعمال صرف اہل بیت کے بارے میں ہی مرسوم ہے

شیعہ محدثین سید ہاشم بحرانی نے غایۃ المرام میں ۴۱/ احادیث اہل سنت کی کتابوں سے اور ۳۴/ احادیث شیعوں کی کتابوں سے نقل کی ہیں اس کے علاوہ تفسیر برہان میں بھی ۶۵ احادیث نقل کی ہیں۔

شیخ عبد علی عروسی نے تفسیر نور الثقلین میں ۲۵ حدیث نقل کی ہیں ان تمام احادیث کا مضمون یہ بتاتاہے کہ پیغمبرؐ نے اہل بیت کے مصداق کی تعیین میں دوراستے اپنائے اور دونوں ہی طریقے اپنی اپنی جگہ پر مفید تھے۔

۱۔ ایک چادر کو پانچوں لوگوں کے سر پر اڑھادیااور حضرت ام اسلمہ بھی اندر آناچاہاتوانہیں روک دیااور پھر پیغمبرؐ نے کہا: خدایایہ میرے اہل بیت ہیں، کثافت کوان سے دور رکھان

۲۔ آیت کے نزول کے بعد سے جب تک پیغمبرؐ زندہ رہے روزانہ صبح کی نماز سے پہلے مسجد ہو جاتے ہوئے حضرت فاطمہ زہراؑ کے دروازے پر آکر سلام کے بعد اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے، جس سے آیت کے مصادیق کا انحصار ثابت ہو تا ہے۔

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ پیغمبر نے فرمایا: "یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی، علی کے بارے میں ،فاطمہ کے بارے میں اور حسن و حسین کے بارے میں نازل ہوئی ہے"

ام سلمہ کہتی ہیں کہ یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی میں نے بھی آیت تطہیر کے نزول کے بعد چادر میں داخلہ کی اجازت چاہی مگر مجھے خیر پر قرار دیتے ہوئے داخلہ سے روک دیا گیا۔

اس روایت سے ثابت ہو گیا کہ آیت تطہیر کا نزول پنجتن سے مخصوص ہے اور بہترین اور پاکیزہ ترین ازواج پیغمبر بھی اس آیت سے مستثنیٰ ہیں۔

پیغمبر کے در زہراؑ پر صبح کے وقت آیت تطہیر کی تلاوت کرنا تفسیر در منثور میں ابو سعید خدری اور ابو الحمراء سے نقل کیا گیا ہے، یہ سلسلہ چالیس دن یا آٹھ ماہ یا نو ماہ جاری رہا تین طرح کی روایات پائی جاتی ہیں۔

اہل سنت کے علام سید علوی حداد نے اپنی کتاب "القول الفصل فیما لبنی ہاشم و قریش من الفضل" میں رقمطراز ہیں کہ ام سلمہ کی روایت کو مسلم نے اپنی صحیح میں ترمذی نے جامع میں احمد ابن حنبل نے مسند میں، حاکم نے مستدرک میں، بیہقی نے سنن میں نسائی نے طبرانی نے معجم کبیر میں ،ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

کیا ان تمام روایات کے باوجود آیت کی کوئی دوسری تفسیر تراشنا عقل و درایت کے مطابق ہے جیسا کہ لاہور کے رسالہ ترجمان الحدیث کے مدیر احسان الٰہی ظہیر نے ان تمام رویات کے ہوتے ہوئے بھی اپنی کتاب الشیعہ و اھل البیت میں ایک خارجی عکرمہ کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل بیت سے مراد ازواج پیغمبرؐ ہیں اور پیغمبرؐ کی اولاد مجازی طور راس میں داخل ہے۔

آیت تطہیر اور علماء اسلام:

علماء اسلام نے آیہ مباہلہ، آیہ مودت اور آیہ تطہیر تینوں کے ذیل میں کم و بیش اہلبیت سے متعلق گفتگو کی ہے اور آیہ تطہیر کے پنجتن کی شان میں نازل ہونے کا ذکر کیا ہے۔

مثلاً ترمذی نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ جب آیہ مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبر نے حضرت علی و فاطمہ اور حسن و حسین کو اپنے پاس بلایا اور دعا کی :خدایا یہی میرے اہل بیت ہیں۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں ۳۴/ مفسرین و محدثین سے آیت تطہیر کا صرف پنجتن کی شان میں نازل ہونا نقل کیا ہے۔[1]

کتاب احقاق الحق کے حاشیہ پر حدیث و تفسیر کی ۷۲/ کتابوں سے یہی مطلب انحصاری طور پر نقل کیا گیا ہے۔[2]

لہٰذا قارئین کو ہم ان کتابوں کے حوالے کرتے ہیں۔

مسئلہ سیاق آیت

سوال یہ ہے کہ جب آیت تطہیر سے پہلے اور بعد میں ازواج پیغمبرؐ کا ذکر ہے تو پھر آیت کا یہ ٹکڑا جسے ہم آیت تطہیر کہہ رہے ہیں اس کا رابطہ ازواج پیغمبر سے کیونکر ختم ہو گیا اور بالکل درمیان میں ایک نئے گروہ کا تذکرہ کیوں کر دیا گیا؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عبارت اور جملوں کے سیاق و سباق کا اتحاد ہی اس کے معنی کو واضح کرتا ہے لیکن یہ اتحاد وہاں جملے کے مفہوم کو واضح کرے گا جہاں اس سے مختلف مفہوم کی دلیل اس سے قوی تر نہ پائی جاتی ہو۔

آیت تطہیر میں مسئلہ یہی ہے کہ متواتر احادیث نے آکر اس آیت کے ٹکڑے کو قبل و بعد کے جملوں سے جدا کر دیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ آیت تطہیر نزول کے لحاظ سے ایک مستقل اور جدا آیت ہے جس کا کوئی تعلق آیت ۳۳ کے تتمہ سے نہیں ہے بلکہ جمع قرآن کے موقع پر اس ٹکڑے کو آیت ۳۳ کے آخر میں رکھ دیا گیا ہے، ورنہ یہ ٹکڑا قبل و بعد کی آیت سے جداگانہ طور پر نازل ہوا ہے۔

پہلا ثبوت: آیت تطہیر کا جداگانہ اور مستقل نزول خود ذکر شدہ روایات منجملہ حضرت ام سلمہ کی مذکورہ روایت سے بھی ثابت ہے چاہے ہم اس آیت کو پنجتن کی شان میں تسلیم کریں یا نہیں۔

کسی بھی روایت میں صراحت یا اشارہ نہیں ہے کہ یہ ٹکڑا اپنے قبل و بعد کی آیات کے ضمن میں نازل ہوا ہے حد یہ ہے کہ عکرمہ اور عروہ جیسے لوگ بھی جب اس آیت کو ازواج سے مخصوص قرار دیتے ہیں تو اس آیت کو مستقل طور سے بیان کرتے ہیں: کہ یہ آیت ازواج کی شان میں آئی ہے۔

وہ لوگ اس آیت کو ما قبل کا تتمہ قرار نہیں دیتے لہٰذا چاہے اس آیت کو پنجتن سے متعلق مانا جائے یا ازواج سے متعلق، تمام مفسرین و محدثین کا اتفاق اس ایت کے جداگانہ نزول پر ہی ہے۔

کسی نے بھی اس آیت کو ما قبل کا حصہ نہیں قرار دیا ہے ایسی صورت میں آیت کے سیاق سے استدلال عقل و منطق کے خلاف ہے بلکہ یہ آیت مستقل طور پر نازل ہو کر دستور پیغمبرؐ سے اس جگہ رکھ دی گئی ہے۔

۱۔ بحار ج۳۵ ص۲۰۶

۲۔ ج۲ ص۵۰۲

قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہمیں دکھائی دیتی ہیں کہ ایک آیت جدگانہ نازل ہوئی اور بعد میں پیغمبرؐ کے حکم سے دیگر آیات سے ملحق کر دی گئی۔

اس بات کو جلال الدین سیوطی نے نقل کیا ہے کہ رسول خداؐ وحی کے مطابق فرماتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھو اور اس آیت کو فلاں مقام پر اور اس طرح جمع قرآن کا کام بھی حکم خدا کے مطابق انجام پایا۔[1]

آیت تطہیر کے ازواج کے تذکرے کے درمیان رکھے جانے سے قرآن کی بلاغت پر کوئی اثر نہیں پرتا بلکہ شیخ طبرسی کے بیان کے مطابق عرب کے بلگاء کے درمیان رائج کہ ابھی ایک موضوع سے متعلق گفتگو ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسرے موضوع کی بات شروع کر دیتے تھے پھر واپس پہلے ہی موضوع کی جانب آجاتے تھے۔[2]

قرآن میں اس کی بہت سی مثالوں میں سے ہم صرف ایک کا تذکرہ کرتے ہیں:

حضرت یوسف کے قصہ میں جب زلیخا کی خیانت سے پردہ اٹھ گیا تو اس کے شوہر نے کہا کہ یہ سب تم عورتوں کی مکاری ہے اور تمہاری مکاری بہت بڑی ہے تمہارے حیلے بہت بڑے ہیں۔

اس کے بعد کہا: یوسف اعرض عن ھذا (حضرت یوسف کا ذکر آگیا) پھر دوبارہ روئے سخن زلیخا کی جانب منتقل ہو گیا اور کہا کہ اے زلیخا اتم خطاکار ہو لہٰذا استغفار کرو اب یوسف سے متعلق مذکورہ جملہ چونکہ زلیخا کے ذکر سے مناسبت رکھتا تھا اسلئے اسے جملہ معترضہ کے طور پر زلیخا کے تذکرے کے درمیان میں رکھ دیا گیا اور اسی مناسبت کی بنا پر آیات کی بلاغت پر کوئی اثر نہیں پرا۔ بس شرط یہ ہے کہ تناسب پایا جاتا ہو۔

لہٰذا ہمیں آیت تطہیر اورازواج کے تذکرے میں بھی واضح مناسبت نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے ازواج پیغمبرؐ کو اس مقام پر سخت ترین لہجہ میں متعدد موضوعات کی تنبیہ کی ہے اور درمیان میں پنجتن کی طہارت و عصمت کا ذکر کرکے گویا ازواج کے لئے ان افراد کو نمونہ عمل بنا کر پیش کیا ہے کہ اے نبی کی بیویو! تمہارے درمیان تو عصمت وطہارت کے پیکر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تمہیں ان کے جوار میں رہنے کا شرف حاصل ہے اس قرب کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی تقوے کی عظیم منزل پر پہونچ کر دنیا کی دیگر خواتین سے ممتاز ہو جاؤ اس لئے کہ تمہارا رشتہ پیغمبر سے ہے اور رابطہ ایسی معصوم ہستیوں سے۔

آیت تطہیر کی اس مناسبت کے بعد ان تمام آیات کی بلاغت مزید روشن ہو جاتی ہے اور پورا کلام انتہائی بلیغانہ ہو جاتا ہے۔

آیت کے جداگانہ نزول کا دوسرا ثبوت:

۱۔ اتقان، ج ۱ ص ۱۷۶

۲۔ مجمع البیان، ج ۸ ص ۳۵۸

دوسرا ثبوت اس واقعیت کا یہ ہے کہ ازواج کی آیات تنبیہ اور سرزنش پر مشتمل ہیں جبکہ آیت تطہیر کا محور تعریف و تمجید ہے لہٰذا دونوں طرح کی آیات کو لحن کے لحاظ سے بھی ایک ہی مخاطب سے متعلق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ورنہ بلاغت کلما کے خلاف ہے۔

آیت کے جداگانہ نزول کا تیسرا ثبوت:

تیسرا ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ اگر آیت تطہیر کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تب بھی قبل وبعد کی آیات کے مفہوم پر ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا اور بلاغت کے اصول کے عین مطابق ہو گا۔

ایک سوال:

اب ایک سوال یہ ہے کہ وحی خدا اس طرح کیوں نازل ہوئی؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ صدر اسلام کے بہت سے مسلمان حضرت علی اور ان کے گھر والوں کے بارے میں حساس تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی نہ کسی جنگ میں اس کے کسی نہ کسی عزیز کو حضرت علی نے قتل کیا تھا۔

اس وجہ سے بغض و کینہ ان کے دل میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ حضرت علی سے انتقام کے لئے رسول خداؐ کی وفات کا انتظار کر رہے تھے۔

لہٰذا عام طور سے رسول خداؐ نے خود ہی یہ اہتمام کیا کہ جن آیات قرآنی کا تعلق حضرت علی اور ان کے گھر والوں کی عظمت سے تھا انہیں اس طرح قرار دیا کہ زیادہ تجلی نہ کریں اور مسلمانوں کو دھوکہ سے بچانے کے لئے سنت و حدیث کا سہارا لے کر آیت کے مفہوم و مصداق کا اعلان کیا اس طرح آیت کی حقیقت بھی روشن ہو گئی۔

یہاں بھی غالباً اسی مقصد کے تحت رسول نے اس آیت کو ازواج کے تذکرے کے درمیان رکھوایا۔

اس کی ایک اور مثال آیات ولایت میں آیہ اکمال ہے کہ سورہ مائدہ آیت ۳ میں غدیر خم کے میدان میں حضرت علیؑ کے جانشین پیغمبرؐ بن جانے کے بعد دین اور نعمت کی تکمیل کا اعلان ہوا اور قرآن میں اس اعلان کو حرام گوشت اور مردار کے تذکرے کے دمیر ان رکھدیا گیا یعنی اس اعلان کے ذکر سے پہلے بھی مردار وغیرہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی اسی کا ذکر ہے درمیان میں آیت تطہیر کی طرح یہ اعلان ہے کہ آج ہم نے دین کو کامل کر دیا اور نعمت تمام کر دی اور اسلام ہمارا پسندیدہ دین ہو گیا۔

غور کرنے سے پتہ چل جائے گا کہ اس اعلان کا قبل وبعد کے جملوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، حد یہ ہے کہ اگر اس العان کو اس کی جگہ سے ہٹا لیا جائے تو قبل وبعد کے جملوں کی بلاغت اور رابطہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ان کا مفہوم روشن ہے

یہ تو صرف سیاسی مصالح کی بنا پر حساسیت سے بچانے کے لئے اس اعلان کو حرام گوشت کی فہرست اور اس کے حکم کے درمیان رکھ دیا تا کہ پنجتن کے قرآنی فضائل محفوظ رہ جائیں۔

ہم نے اس کی تفصیل اپنی کتاب "تفسیر صحیح آیات مشکلہ قرآن" میں بیان کر دی ہے۔

اہل بیت کے مصداق کے بارے میں دیگر نظریات:

گزشتہ مشہور و معروف نظریہ کے مقابلہ میں کچھ شاذ نظریات بھی پائے جاتے ہیں جو ہم نقل کر رہے ہیں:

۱۔ بیت سے مراد بیت اللہ الحرام ہے اور اس کے اہل سے مراد مکہ کے رہنے والے ہیں خصوصاً ان میں کے اہل تقویٰ لوگ۔

۲۔ بیت سے مراد مسجد پیغمبرؐ ہے اور اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے گھر مسجد کے اطراف میں تھے اور ان کے دروزے مسجد کے اندر کھلا کرتے تھے یعنی مخصوص اصحاب پیغمبرؐ۔

۳۔ اہل بیت سے مراد وہ ولوگ ہیں جن پر صدقہ (زکات) حرام ہے اور وہ یہ لوگ ہیں: حضرت علیؑ، عقیل، جعفر طیار اور عباس بن عبد المطلب کی اولادیں۔

۴۔ اہل بیت سے مراد صرف اور صرف ازواج پیغمبرؐ ہیں جس کی دلیل خود آیات کا سیاق اور سلسلہ ہے۔

۵۔ اہل بیت سے مراد ازواض پیغمبرؐ اور اولاد پیغمبرؐ نیز حضرت علیؑ کی اولاد ہے اور حضرت علی کی اولاد اس لئے شامل ہے کہ آپ کا آنا جانا پیغمبرؐ کے گھر بہت زیادہ تھا۔[1]

چوتھے اور پانچویں نظریہ کے علاوہ کسی بھی نظریہ کی کوئی دلیل نہیں ہے اور سبکے سب تفسیر بالرای کا مصداق ہیں۔

پہلا اور دوسرا نظریہ: یہ دونوں نظریے اس لئے باطل ہیں کہ یہی لفظ اہل بیت قرآن میں دیگر مقامات پر بھی ان دونوں معانی مین استعمال نہیں ہوا ہے مثلاً سورہ ہود ۷۳ میں فرشتوں نے حضرت سارہ سے یہی لفظ استعمال کیا اور اسی طرح سورہ قصص ۱۲ کے مطابق حضرت موسیٰ کی بہن کلثوم نے دربار فرعون میں کہا کہ کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کی طرف رہنمائی کروں جو اس بچے کی کفالت کر سکیں اور دودھ پلا سکیں۔

اس بنا پر لفظ اہل بیت کی تفسیر اہل مکہ یا پیغمرؐ کی مسجد کے پڑوسیوں سے کرنا آیت کے سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی خلاف عقل و درایت ہے اس لئے کہ آیت کے قبل و بعد کا موضو ازواج پیغمبرؐ ہیں۔

تیسرا نظریہ: اس نظریہ کا بھی یہی حال ہے اس لئے کہ اہل بیت کی تفسیر ان لوگوں سے کرنا جن پر صدقہ (زکات) حرام ہے محض دعوائے بے دلیل ہے اس لئے کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے وہ لوگ پیغمبرؐ کے گھر سے کوئی خاص رابطہ بھی نہیں رکھتے تھے اور اصلاً نزول قرآن کے موقع پر

۱۔ تفسیر طبری، در منثور، مفاتیح، کشاف اور مجمع البیان

مدینہ سے بھی دور رہا کرتے تھے، اس لئے وہ لوگ کسی بھی طرح پیغمبرؐ کے اہل بیت میں شمار نہیں ہوسکتے خواہ لفظ بیت سے مراد اینٹوں اور مٹی کا گھر ہو یا وحی اور نبوت کا گھر ہو۔

اسکے علاوہ یہ کہ صدقہ (زکات) صرف حضرت ابو طالب کے تینوں بیٹون اور عباس بن عبد المطلب کی اولاد پر ہی حرام نہیں تھا بلکہ صدقہ شیعہ فقہ کے لحاظ سے تمام بنی ہاشم پر حرام ہے اور یہ بات روشن ہے کہ حضرت ہاشم کے دو بیٹوں اسد اور عبد المطلب میں سے اولاد کا سلسلہ صرف حضرت عبد المطلب کے ذریعہ ہی آگے برھا اس بنا پر صدقہ (زکات) حضرت عبد المطلب کے تمام بیٹوں پر حرام ہے حتیٰ ابو لہب اور اس کی اولاد پر بھی۔

شافعی فقہ کے لحاظ سے حضرت عبد مناف کی ساری اولاد پر صدقہ حرام ہے اس بنا پر ضناب ہاشم بن عبد مناف کے بھائی مطلب کی اولاد پر بھی صدقہ حرام ہے۔

بہر حال کسی بھی فقہ کے مطابق صدقہ کی حرمت صرف حضرت ابو طالب اور حضرت عباس کی اولاد سے ہی مخصوص نہیں ہے۔[1]

لازم بہ ذکر ہے کہ یہ نظریہ (تیسرا نظریہ) صحیح مسلم میں رسول کے صحابی زید بن ارقم سے منقول ہے۔[2]

چوتھا نظریہ: اس نظریہ کی ہم اس سے پہلے بھی مکمل تحقیق کر چکے ہیں یہاں پر بس خلاصہ نقل کیا جا رہا ہے کہ یہ نظریہ بھی باطل ہے اسلئے کہ پہلی بات یہ ہے کہ آیت تطہیر سے پہلے کی آیات میں ازواج پیگمرب کے لئے ازواجک اور نساء النبی کا لفظ آیا ہے جبکہ آیت تطہیر میں اہل بیت کا لفظ ہے۔

دوسرے یہ کہ آیت تطہیر تعریف اور مدحت پر مشتمل ہے اور ازواج کا تذکرہ تہدید و توبیخ اور سرزنش پر لہٰذا کسی بھی قیمت پر دونوں کا مخاطب ایک نہیں ہو سکتا۔

تیسرے یہ کہ ازواج کے لئے تمام ضمیریں مونث ہیں اور اہل بیت کے لئے مذکر۔ ضمیروں کا اختلاف بھی مخاطب کی دوئیت کی دلیل ہے۔

چوتھے یہ کہ آیت تطہیر کا مفہوم عصمت اہل بیت کا بیان ہے جبکہ ازواج کو کسی مسلمان نے بھی معصوم نہیں مانا ہے۔

ازواج پیغمبرؐ کے معصوم نہ ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے ان چاروں باتوں کے علاوہ احادیث و روایات کا بہ کثرت پایا جانا نیز حضرت ام سلمہ کو چادر میں داخلہ سے رسولؐ کا روک دینا۔۔ یہ سب دلیل ہے کہ ازواج پیغمبرؐ آیت تطہیر کی مصداق نہیں ہیں۔

۱۔۔ خلاف، شیخ طوسی، ج۲، کتاب الوقاف والصدقات ج ا ص ۲۲۷ اور کتاب قسمۃ الصدقات، ج ۲ ص ۳۵۳ مسئلہ ۲۶

۲۔ صحیح مسلم، ج ۷ کتاب فضائل الصحابہ، باب فی فضائل علی، ص ۱۲۲

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت تطہیر کو ازواج پیغمبرؐ سے مخصوص قرار دینے کا نظریہ تین لوگوں سے منسوب ہے عکرمہ، مقاتل بن سلیمان اور عروہ بن زبیر۔

عکرمہ بازاروں میں چلاتا تھا اور کہتا تھا: لوگو! آیت تطہیر ازواج پیغمبرؐ کی شان میں آئی ہے اور ایسا نہیں ہے جیسا لوگ اس آیت کے بارے میں سوچتے ہیں"

کبھی کہتا تھا کہ میں بحث و مباہلہ کے لئے بھی تیار ہوں یہ آیت صرف ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں آئی ہے۔[1]

ظاہر ہے کہ عکرمہ کا اس بات پر اتنا اصرار کرنا حتیٰ مباہلہ کے لئے تیار ہو جانا اور بھی صرف آیت تطہیر کے بارے میں ہر سننے والے کو شک میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ عکرمہ کا تعلق خوارج تھا۔

یہی حال مقاتل بن سلیمان کا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک اہل کتاب سے متعلق آیات قرآن کی تفسیر یہود نصاریٰ کے علماء سے نقل کرتا تھا اور خدا کو مخلوقات سے تشبیہ دیتا تھا اور جھوٹی حدیثیں نقل کرتا تھا۔

ابن ابی حاتم کے نزدیک اس کی بیان کردہ روایت قابل اعتبار نہیں وہ ایک جھوٹا انسان تھا۔

امام نسائی اور جرجانی نے اسے کذاب اور دجال و مکار قرار دیا ہے۔[2]

تیسرا شخص اس نظریہ کا حامی عروہ بن زبیر ہے جو اپنے بھائی عبد اللہ بن زبیر کی طرح حضرت علیؑ کے خاندان کی دشمنی میں مشہور تھا۔

متواتر روایات کی روشنی میں عروہ حضرت علیؑ کا نام سنتے ہی آپ کا برا بھلا کہتا اور غصہ سے کانپنے لگتا تھا۔[3]

اب ہم دونوں طرح کے راویوں کا تذکرہ کر دیا فیصلہ خود مسلمان کے ہاتھ میں ہے کہ کس قول کا انتخاب کرتا ہے۔

پانچواں نظریہ: اس نظریہ کے حامیوں نے ازواج پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ پنجتن کو بھی آیت تطہیر کا مصداق قرار دیا ہے اور گویا دونوں کو خوش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اس طرح دونوں کے دلائل پر عمل کرنا چاہا ہے۔

اس لئے کہ آیت کے داخلی اور خارجی دلائل سے یہ چابت ہے کہ قطعی طور پر یہ آیت ازواج کے بجائے خمسہ طیبہ کی شان مدحت میں نازل ہوئی ہے۔

۱۔ اسباب النزول، واحدی، ص ۲۰۴ اور در منثور ج ۵ ص ۱۹۸

۲۔ میزان الاعتدال، ج ۴ ص ۱۷۳

۳۔ شرح حدیدی، ج ۴ ص ۶۹

جبکہ اس آیت کے قبل وبعد کی آیات کے سلسلے کا تقاضا یہ ہے کہ آیت تطہیر بھی ازواج پیغمبرؐ کی شان میں ہو لہٰذا انہوں نے کہا کہ آیت کا تعلق تمام ان لوگوں سے ہے جن کا حسبی، نسبی یا سببی رشتہ پیغمبرؐ سے تھا اور وہ ازواج پیغمبرؐ ہیں نیز حضرت علیؑ وفاطمہ اور ان کی اولاد آیت ان سے کی شان میں ہے ان لوگوں سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ البیت کا الف لام جنس یا استغراق کے لئے نہیں ہے بلکہ عہد کے لئے ہے جس سے مراد ایک مخصوص گھر ہے جو صرف متکلم اور مخاطب کے ذہن میں معین ہے اب اگر گھر سے مراد آیت میں اینٹ پتھر اور مٹی کا گھر ہے تو وہ معین ہے اور اس سے مراد پیغمبرؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا کا گھر یقینی طور پر ہے اور ازواج کے گھروں کے بارے میں شک وشبہہ ہے۔

اب چونکہ الف لام عہد کے لئے ہے لہٰذا مراد صرف ایک گھر ہو گا نہ کہ بہت سے گھر کہ ازواج کے گھر الگ الگ اور بہت سے تھے انہیں قرآن نے بیوت کہا ہے اور اگر گھر سے مراد مادی گھر کے بجائے معنوی گھر ہے یعنی نبوت ووحی کا مرکز تو پھر گھر والے وہ ہوں گے جن کے جسم وروح کا عمیق رشتہ رسولؐ کی نبوت ورسالت اور وحی الٰہی سے ہو اور گویا انہیں کے قول وعمل سے پیغام رسالت زندہ ہو۔

اس اعتبار سے بھی ازواج پیغمبرؐ آیت کے تعلق سے باہر ہیں اور آیت صرف پنجتن سے مخصوص ہو کر رہ جائے گی۔ کہ پنجتن ہی وہ ہیں جو نبوت ورسالت کے کمالات کا مظہر ہیں اور ازواج پیغمبرؐ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے اور عرب میں لفظ بیت کا استعمال مادی گھر کے بجائے معنوی گھر کے معنی میں ہونا بھی ایک متداول امر۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے یہ چاہت کیا کہ آیت میں ارادہ خدا تکوینی ہے نہ کہ تشریعی اور اس تکوینی ارادہ سے اہل بیت عصمت ثابت کرنا مقصود آیت ہے اور تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ازواج پیغمبرؐ معصوم نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر آیات کے سیاق وسلسلے کی بنا پر اہل بیت میں ازواج بھی شامل ہیں تو پھر سیاق کی مناسبت سے ہی تمام ضمیروں کو مؤنث ہونا چاہئے تھا لیکن آیت تطہیر میں ضمیریں مذکر ہو گئیں لہٰذا اگر مفہوم میں مناسبت اور وحدت ہے تو الفاظ میں بھی اتحاد ہوتا۔

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ آیت تطہیر میں ضمیروں کا مذکر ہونا تغلیب کی بنا پر ہے یعنی مردوں کو عورتوں پر غلبہ حاصل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تغلیب کا معیار افراد کی کثرت ہے نہ کہ افراد کا مردوزن ہونا اس بنا پر آیت میں بہت حال عورتوں کی تعداد زیادہ ہے (ازواج اور حضرت فاطمہ زہراؑ) اور مرد صرف چار ہیں (پیغمبرؐ اور حضرت علیؑ نیز حسنین) اس لئے آیت میں ضمیروں کو تغلیب کی بنا پر بھی مونث ہی آنا چاہئے تھا نہ کہ مذکر ہماری آخری اور چوتھی دلیل خود متواتر روایات اور عمل پیغمبرؐ ہے جس سے آیت ازواج کے بجائے صرف پنجتن سے مخصوص ہو جاتی ہے۔

اس لئے مذکورہ تفسیر در حقیقت کثیر روایات اور تصریحات پیغمبر کے خلاف ہے، لہٰذا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ سیاق کے اتحاد کی خاطر تمام متواتر روایات اور پیغمبرؐ کی عملی تصریحات سے مکمل طور پر چشم پوشی کر لی جائے۔

اللہ نے قرآن کو پیغمبرؐ پر نازل کیا اور آپ کو قرآن کا سب سے پہلا مفسر قرار دیا۔ جیسا کہ سورہ نحل آیت ۴۴ میں آیا ہے، ہم نے تم پر قرآن نازل کیا تا کہ لوگوں کے لئے اسے بیان کرو اور لوگ اس میں غور وفکر کریں"۔

چنانچہ پیغمبرؐ نے بھی زبان و عمل دونوں سے قرآن کی تفسیر کی جیسا کہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے۔

ترمذی نے اپنی صحیح میں سعد ابن وقاص سے نقل کیا ہے کہ مباہلہ کے موقع پر پیغمبرؐ نے علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو پاس بلا کر دعا کی: خدایا! یہ میرے اہل ہیں۔ پھر ایک چادر میں ان حضرات کو آپؐ نے جمع کر کے دعا کی: خدایا! یہ میرے اہل بیت ہیں تو انہیں آلودگی سے محفوظ رکھنا۔

اتنے میں حضرت ام سلمہ نے آکر شادر میں داخلہ چاہااور کہا کہ کیا میں بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں؟ تو پیغمبرؐ نے فرمایا تمہارا مقما اور ہے اور تم خیر پر ہو۔[1]

صحیح مسلم میں بھی اسی مفہوم پر مشتمل روایت پائی جاتی ہے، یہ روایات تو صحیح کتابوں میں ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سی روایات اور بھی ہیں جو طبری نے اپنی تفسیر اور سیوطی نے تفسیر در منثور میں نقل کی ہیں ان تمام روایات کی بنا پر یہ حقیقت تواتر کی حدوں سے بھی تجاوز کر جاتی ہے کہ آیت تطہیر صرف پنجتنؑ سے ہی مخصوص ہے اور اس کا کوئی تعلق ازواج پیغمبر سے نہیں ہے اور نہ پیغمبرؐ سے اس کی کوئی معتبر تصریح نقل ہوئی ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آیت کو پنجتنؑ کے علاوہ کسی سے بھی متعلق قرار دینا خواہ عمومی طور سے ہو یا خصوصی طور سے یہ در حقیقت تفسیر بالرای اور نص (صراحت) کے مقابلہ میں اجتہاد کرنا ہے جو باطل ہے۔

۱۔ جامع الاصول، ج ۲، ص ۱۰۱